آزادی کے بعد
دہلی میں اُردو کے ادبی رسائل
کا تنقیدی جائزہ
ڈاکٹر شعیب رضا وارثی
Meer Zaheer Abass Rustmani

آزادی کے بعد

دہلی میں اُردو کے ادبی رسائل

کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر شعیب رضا وارثی

Aazadi Ke Baad
Dehli Mein Urdu Ke Adabi Rasael
Ka
Tanqeedi Jayeza
By
Dr. Shoaib Raza Warsi
1997
Price Rs. 150.00

سنہ اشاعت : اکتوبر ۱۹۹۷ء
قیمت : -/۱۵۰ روپے
تعداد : ۴۰۰
کمپوزنگ : افراح کمپیوٹر سینٹر
D-15 گلی نمبر ۲، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۲۵

ملنے کا پتہ :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202002

انتساب

والدین، بہنوں

اور

بھائیوں کے نام

جن کی شفقتیں

اور

محبتیں

زندگی کی راہوں میں اُجالوں کی طرح

میرے ساتھ ہیں

شعیب رضا وارثی

یہ کتاب

اُردو اکادمی، دہلی

کے

مالی تعاون سے شائع ہوئی

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر

اس مقالہ پر مصنف کو
جواہرلال نہرو یونیورسٹی
سے
پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری
تفویض کی گئی

پیش لفظ

دہلی کو زمانۂ قدیم سے ہندوستان کا مرکز ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ زبانِ اردو کی ابتداء اور ارتقاء میں اس شہر کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے۔ شاہانِ مغلیہ کے درباروں میں شعراءِ اردو کی حوصلہ افزائیوں کے نتیجے میں دہلی کے گلی کوچے اردو شعر و سخن سے آباد ہو گئے تھے اور وہ ادبی ماحول جو میرزا مظہر جانِ جاناں، آبرو، خان آرزو، میر تقی میر، خواجہ میر درد دہلوی، سودا، ذوق، غالب، داغ، مومن وغیرہ کی کاوشوں کے نتیجے میں پیدا ہوا، اس کو برقرار رکھنے میں یہاں کے اہل ذوق حضرات نے ہمیشہ سنجیدہ کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ کوششیں ادبی محفلوں، مشاعروں، کانفرنسوں، سیمناروں کے علاوہ اخبارات و رسائل کی اشاعت کی شکل میں ہمیشہ سامنے آتی رہی ہیں۔ ان میں آخر الذکر کے بارے میں تفصیلی گفتگو کے لیے ہم نے موجودہ موضوع کو منتخب کیا ہے۔

دہلی میں ایک عرصے سے یہاں کے ادبی ماحول پر تحقیقی و تنقیدی کام ہو رہا ہے۔ مثلاً دہلی میں آزادی کے بعد اور آزادی سے قبل اردو افسانہ، شاعری، صحافت، انشائیہ، تحقیق وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آزادی کے بعد دہلی میں جو ادبی رسائل شائع ہوئے یا ہو رہے ہیں ان کا تفصیلی تو کیا اجمالی جائزہ بھی قاعدے سے ابھی تک نہیں لیا گیا ہے۔ راقم السطور کے ذہن میں دہلی کے اردو کے ادبی رسائل کا جائزہ لینے کا خیال اس لیے پیدا ہوا کہ ان رسائل نے اردو ادب کے فروغ میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان رسائل کے جائزے سے بہت سی اہم باتیں سامنے آسکتی ہیں مثلاً کون سا رسالہ کب جاری ہوا؟ اس کے مدیران کون کون رہے؟ کس رسالے کی کیا پالیسی تھی؟ کن ادبی رجحانات و تحریکات کو ان کے ذریعے فروغ ملا؟ عصری حالات و واقعات کی جھلکیاں کس حد تک ان میں دکھائی دیتی ہیں؟ ان رسائل میں کس قسم کی شعری و نثری نگارشات شائع ہوتی رہیں؟ تحقیقی و تنقیدی مضامین کس طرح کے چھپے ہیں وغیرہ۔

مذکورہ نکات پر تفصیلی بحث کرنے کے لیے ہم نے اس مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے اردو کے ادبی رسائل کا تعارف اس طور پر پیش کیا ہے کہ ہر رسالے کی تاریخِ اجرا، زمانۂ اشاعت اور مدیران کے بارے میں معلومات پیش کردی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں جدید ادبی تحریکات ورجحانات کے فروغ میں دہلی کے ادبی کردار پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اردو ادب آزادی کے بعد جن تحریکوں اور رجحانات سے متاثر ہوا ہے، وہ کیا ہیں اور ان رسائل نے ان کی نمائندگی کس حد تک کی ہے۔ تیسرا باب دہلی کے ادبی رسائل کے اداریوں پر مشتمل ہے۔ اس باب میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ دہلی کے یہ ادبی رسائل اپنے اداریوں میں کن ادبی مباحث کو اٹھاتے رہے ہیں اور عصری زندگی سے ان کا تعلق کس حد تک رہا ہے۔ چوتھے باب میں ان رسائل میں شائع ہونے والی شعری اصناف کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں نظم، غزل، قطعات، آزاد نظم، نظم معریٰ، دوہے گیت وغیرہ شامل ہیں۔ پانچویں باب میں نثری اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں ناول، افسانہ، انشائیہ، ڈرامہ، طنز و مزاح، خاکہ اور سوانح وغیرہ کے عنوانات کے تحت دہلی کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والی نثری تخلیقات کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں دہلی کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والے تحقیق و تنقیدی مضامین کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں مقالے کا لب لباب ماحصل کے عنوان سے پیش کردیا گیا ہے۔

موضوع بہت وسیع تھا لیکن پھر بھی ہم نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ اس موضوع کے ساتھ انصاف ہوسکے۔ راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہوئیں۔ اوّل تو رسائل کی فائلوں کی دستیابی مشکل امر تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود تمام مطلوبہ رسائل کی مکمل فائلیں نہیں مل سکیں۔ بعض رسائل کے صرف ایک دو شمارے ہی دستیاب ہوسکے۔ بہر حال جو فائلیں اور شمارے ہمیں دستیاب ہوئے انہی کی روشنی میں ہم نے اپنا مقالہ ترتیب دیا ہے۔ کہیں کہیں اختصار سے بھی کام لینا پڑا ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ کرتے تو مقالے کی طوالت بہت بڑھ جاتی اور ایک محدود وقت میں اس کی تکمیل مشکل ہوتی۔ اس مقالے میں پندرہ روزہ جرائد کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان رسائل کو بھی شاملِ مطالعہ نہیں کیا ہے جن میں زیادہ تر مواد عوامی دلچسپی کا ہے اور وہ ہلکی پھلکی تفریح فراہم کرتے ہیں لیکن ان

میں بعض تخلیقات معیاری بھی ہوتی ہیں۔ یا وہ رسائل جو خالص علمی ہیں اور جن میں اکاّ دکاّ ادبی تخلیقات بھی شائع ہوتی ہیں، ہمارے مطالعے سے باہر ہیں۔

احقر کا خیال ہے کہ اس قسم کا مطالعہ اردو میں پہلی بار کیا گیا ہے۔ اس لیے کوئی نمونہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اپنی صوابدید پر جو طریقۂ کار مناسب نظر آیا اس کے مطابق کام کیا۔ اس کا احساس بھی ہے کہ موضوع کے جو تقاضے تھے ان کو یہ مقالہ بحسن و خوبی پورا نہیں کر سکا ہے۔

اس مقالے کی تیاری میں اول تا آخر استاذ محترم پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب کی رہنمائی شامل رہی۔ ان کی کرم فرمائیاں نہ ہوتیں تو یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچنا محال تھا۔ ان کی ان عنایات کے لیے راقم تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی اگر میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی کا شکریہ نہ ادا کروں۔ ان حضرات نے مجھے ہر قدم پر تحقیق کی طرف راغب کیا۔ جن حضرات نے میری باضابطہ طور پر ریسرچ میں مدد کی ہے ان میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ، وشوناتھ درد، انور عظیم، پریم گوپال متل، شمیم احمد، مسز کمار پاشی، مس کمار پاشی، بلراج مین را، پروفیسر محمد حسن، حکیم حسین خاں شفا، سید محفوظ علی، عتیق جیلانی، زبیر رضوی، تجمل حسین خاں، [illegible] آرا، آصف علی، ظہیر رحمتی، ریحان خاں، شکیل جہانگیری اور احمد محفوظ کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر شعیب رضا وارثی

۱۴۶ کاویری ہاسٹل
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۶۷

باب اول

دہلی سے شائع ہونے والے
اردو کے ادبی رسائل کا تعارف

(آزادی سے قبل آزادی کے بعد)

اخبارات و رسائل اپنے عہد کے حالات، واقعات، ماحول اور سماج کی حقیقی تصویر اور تاریخ ہوتے ہیں یہ اپنے دور کے حالات و ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اخبارات و رسائل کا رشتہ عوام سے بالکل اسی طرح ہوتا ہے، جس طرح رہبر و لیڈر و مصلح کا۔ یہ اپنے عہد کی برائیوں اور نقصان دہ رسم و رواج دور کرنے کی سعی کرتے ہیں اور عوام کی کوتاہیوں کو دور کرنے کی بھی سعی کرتے ہیں۔ چناں چہ انکی یہ بھی کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنے دور کے انسانیت سوز طور طریقے، بری عادتیں اور جہالت کو ختم کریں اور اپنے زمانے کی ثقافت اور اپنے ادب کو بہتر سے بہتر شائستہ اور عام فہم بنائیں۔

ہندوستان میں صحافت کی تاریخ کا ذکر کرنے سے قبل اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اشوک کے عہد سے لے کر مغلوں کے دور تک خبروں کی ترسیل و اشاعت کا محدود پیمانے پر کوئی نہ کوئی نظام ہمیشہ موجود رہا تھا۔ جو ہر زمانے میں فرماں رواؤں کو ملک کے حالات سے اور رعایا کے خیالات سے باخبر رکھنے کی خدمت انجام دیتا تھا۔ ہر عہد کے ہندوستانی حکمرانوں نے خبر رسانی کے لیے ڈاک کے نظام کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ خبر رسانی اور ڈاک کے نظام کو شیر شاہ نے اپنے دور میں کافی فروغ دیا۔ اس واقعہ کی تصدیق اس بات سے ہو جاتی ہے کہ شیر شاہ کو کلکتے سے لے کر پشاور تک کی خبریں تین روز کے اندر حاصل ہو جاتی تھی۔ آگے چل کر مغلوں نے خبر رسانی کو اعلیٰ پیمانے پر ترقی دی اور خبریں حاصل کرنے کے لیے وقائع نگار، سوانح نگار، خفیہ پولیس اور ہرکارے متعین کیے۔ جو سلطنت کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک بیان کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب

کے عہد میں شاہی محل کے لیے روزانہ ایک اخبار بھی جاری ہوتا تھا۔ اس اخبار کی نوعیت آج کے دور کی طرح نہیں تھی، وہ صرف بادشاہ کے لیے ہی جاری ہوتا تھا۔

مغلوں کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر کے دور میں تو اس نوع کے شاہی اخبار نے "سراج الاخبار" کے نام سے مطبوعہ شکل اختیار کرلی تھی۔ اس اخبار کی رسائی شاہی محل کے باہر امراء اور عمائدین تک بھی تھی۔ اس دور کے دوسرے مطبوعہ اخبارات میں اس کی خبریں "اخبارِ قلعہ معلیٰ" کے حوالے سے بھی نقل کی جاتی تھیں، لیکن ان سب اخباروں کا تعلق دربار سے تھا، انھیں عوامی اخبار نہیں کہا جاسکتا۔ عوامی اخبارات کا دور طباعت کی ترقی کے بعد شروع ہوتا ہے۔

ہندوستان میں طباعت کی تاریخ پرتگالیوں اور مسیحی مبلغین کی آمد سے وابستہ ہے۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما مالابار کے ساحل پر پہنچا، اس کی آمد کے چند برسوں کے بعد پرتگالی مبلغین کی کشتیاں بھی جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر آنے لگیں۔ یہی مبلغین ۱۵۵۰ء میں چھپائی کا سامان اپنے ساتھ لائے تھے۔ انھوں نے تامل زبان میں عیسائی مذہب کی ایک کتاب بھی مالا بار میں چھاپی۔ اس وقت ہندوستان میں اکبر اعظم کا عہد تھا۔ اس کے دربار میں جو عیسائی علماء تھے، انھوں نے طباعت کے نمونے بھی اس کی خدمت میں پیش کیے لیکن اس فن کو اس نے قابل توجہ نہ سمجھا کیوں کہ علمی کتاب کی دیدہ زیبی کے مقابلے میں اس وقت کے ٹیڑھے میڑھے ٹائپ اکبر کی نفاست پسند نظروں کو نہ بھائے ہوں گے۔

انگریز جب ہندوستان آئے تو اس وقت یورپ میں طباعت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کررہی تھی اور ہندوستان میں اس فن کی ترویج سے جو خطرات پیدا ہوسکتے تھے وہ بھی بخوبی جانتے تھے۔ انگریزوں کا اگر بس چلتا تو اس فن کو کبھی ہندوستان میں روشناس نہ کراتے لیکن خود ان کی دفتری ضروریات نے ہندوستان میں انھیں چھاپے خانے قائم کرنے پر مجبور کردیا۔

کلکتہ میں باضابطہ پہلا چھاپہ خانہ مسٹر ہکی ہی (Mr. Hickyhi) نے ۱۷۷۸ء میں قائم کیا۔ اس چھاپے خانے سے ہندوستان کا پہلا مطبوعہ اخبار نکالا گیا۔ ہکی ہی کے چھاپہ خانے کے علاوہ بھی سرکاری طور پر طباعت کا انتظام و انصرام یقیناً رہا ہوگا جس کے شواہد ابھی تک کہیں نہیں ملتے۔

ہندوستان میں ۲۱۲ سال قبل صحافت کا آغاز ہوا۔ ۱۷۸۰ء میں کلکتہ سے ہندوستان کے پہلے دو اخبارات کا اجراء ہوا تھا۔ پہلا اخبار جو اپنے مالک اور ایڈیٹر مسٹر ہکی ہی کے نام سے ملتا جلتا ''ہکیز گزٹ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا دوسرا نام ''کلکتہ جنرل ایڈورٹائز'' بھی تھا۔ ۲۹ر جنوری ۱۷۸۰ء میں اس ہفتہ وار اخبار کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ یہ اخبار ۱۷۸۲ء تک جاری رہا۔ مارچ ۱۷۸۲ء کو سرکار کی جانب سے مسٹر ہکی ہی کا چھاپہ خانہ ضبط کرلیا گیا۔ اس طرح ہندوستان کے پہلے اخبار نے دو سال اور دو ماہ کی زندگی دیکھی۔ ''ہکی گزٹ'' کے اجراء کے نو ماہ بعد نومبر ۱۷۸۰ء میں ''انڈیا گزٹ'' کلکتہ ہی سے جاری ہوا جو ہندوستان کا دوسرا انگریزی ہفتہ وار اخبار تھا اور اپنے پیش رو کے جواب میں نکالا گیا تھا۔ '' ہکی گزٹ'' کے بند ہو جانے کے بعد بھی یہ اخبار طویل مدّت تک جاری رہا کیوں کہ '' ہکی گزٹ'' کے برعکس اس کو حکومت کی حمایت و سرپرستی حاصل تھی۔

''ہکی گزٹ'' اور ''انڈیا ایڈورٹائز'' کے اجراء کے بعد ہندوستان میں انگریزی صحافت کی فضا ہموار ہوگئی۔ اس طرح مارچ ۱۷۸۴ء میں کلکتے ہی سے ہندوستان کے تیسرے انگریزی ہفتہ وار ''کلکتہ گزٹ'' نے جنم لیا۔ اس اخبار کو بھی حکومت کی نیم سرپرستی حاصل تھی، اس اخبار کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فارسی، عربی اور بنگلہ زبانوں کے اشتہارات بھی نظر آتے ہیں، جنھیں ان زبانوں کی طباعت کا اولین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس اخبار کے ابتدائی دور کے شماروں میں فارسی زبان اور فارسی رسم خط بھی، مغل دربار کی خبریں بھی انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ عبداللہ یوسف علی مرحوم کلکتہ گزٹ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا پہلا مطبوعہ اخبار ہے'' لیکن عتیق صدیقی ان کے اظہار پر بیان دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کلکتہ گزٹ'' کے اس فارسی کالم کو ہندوستانی مروجہ زبانوں کے اخبارات کا پیش رو کہنا ہی زیادہ قرین صحت ہوگا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کلکتہ ہی سے آٹھ نو انگریزی اخبارات کے اجراء کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر اخبارات صاحب مطبع تھے اور ان مطابع میں فارسی رسم خط کے ٹائپ بھی موجود تھے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں فارسی اور اردو صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں فارسی اور اردو کے بہت سے اخبارات نے جنم لیا۔ راجہ رام موہن رائے نے فارسی کے

پہلے اخبار کا اجرا کلکتہ سے ۱۸۲۲ء میں "مراۃ الاخبار" سے کیا ہے۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔ اس اخبار کے علاوہ شمالی ہند سے فارسی کے بہت سے اخبارات جاری ہوئے۔ مثلاً "زبدۃ الاخبار، سراج الاخبار، آئینۂ سکندری، ماہِ عالم افروز، سلطان الاخبار، لدھیانہ اخبار، احسن الاخبار" وغیرہ۔ ان اخبارات کی اشاعت اس بات کی دلیل ہے کہ انیسویں صدی کے نصف تک ملکی اور دیسی زبانوں میں صحافت کافی ترقی کر چکی تھی۔ یہ اخبارات محض خبر رسانی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس دور کے زبان و ادب کی ترجمانی بھی کرتے تھے۔

موجودہ تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" کلکتہ سے ۱۸۲۲ء میں جاری ہوا۔ یہ اردو صحافت کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ اردو (جام جہاں نما) اور فارسی (مرآۃ الاخبار) کا چند روز کے تفاوت سے ایک ساتھ اجراء ہوا تھا۔ "جام جہاں نما" کے صرف چھ شمارے شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد اسے فارسی زبان میں تبدیل کر کے نکالنا شروع کیا گیا۔ "جام جہاں نما" انگریزوں کی تجارتی کوٹھی کی ملکیت تھا اور اس کا مقصد کلکتہ کے انگریزوں کو ہندوستانی سماج سے واقف کرانا تھا۔

۱۸۲۸ء میں "جامِ جہاں نما" کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد اردو صحافت کی دنیا کم و بیش پندرہ سال تک تاریکی میں رہی اور اس دوران اردو صحافت کی زندگی میں ایک بھی شمع ایسی روشن نہ ہو سکی جو اس تاریکی میں امید کی روشنی بکھیرتی۔ ۱۸۳۶ء تک اردو صحافت میں کوئی پیش رفت نظر نہیں آئی جب کہ ہندوستان میں دوسری زبانیں اس راہ میں آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن پھر ۱۸۳۵ء میں اردو کو سرکاری اور عدالتی زبان کا درجہ ملنے کے ساتھ ساتھ صحافت کو بھی آئینی طور پر آزادی مل گئی تھی جس کے باعث ۱۸۳۷ء میں اردو کے تین اخبارات جاری کیے گئے۔ جس میں دو اخبار دہلی سے اور ایک مرزاپور سے دہلی میں سب سے پہلے "اخبار دہلی" کا اجرا ہوا جو بعد میں "دہلی اردو اخبار" کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں اس اخبار کا نام "اخبار الاظفر" رکھ دیا گیا۔ "دہلی اردو اخبار" کو محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر نے نکالنا شروع کیا تھا۔ محققین اس بات سے متفق ہیں کہ "اخبار دہلی" اردو کا دوسرا اخبار تھا اور شمالی ہند کا پہلا اخبار۔ اس اخبار کی سنہ اشاعت کی وضاحت کرتے ہوئے عتیق صدیقی کہتے ہیں :

"یہ دہلی کا پہلا اخبار تھا۔ اس کا ۱۸۳۷ء میں اجرا ہوا اور اردو اخباروں کے متعلق

جو منتشر اور محدود مواد اب تک سامنے آیا ہے اس کی روشنی میں دہلی اخبار شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اخبار تھا۔" ۱

(عتیق صدیقی : ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں ص-۲۶۶)

دہلی اردو اخبار کی اشاعت کے بعد اردو صحافت کی دنیا میں زبردست بیداری اور حرکت پیدا ہو گئی۔ ملک کے مختلف حصوں سے بے شمار اردو اخبارات کا اجرا ہوا۔ دہلی میں بھی کافی تعداد میں اخبارات کی اشاعت یکے بعد دیگرے ہوئی جو سیاسی اور سماجی اعتبار سے الگ اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً "سید الاخبار، مظہر حق، صادق الاخبار، قرآن السعدین، کریم الاخبار، گل رعنا"۔ چند اخبارات ایسے بھی شائع ہوئے ہیں جن کی سائنس، قانون اور تاریخی اعتبار سے بھی کافی قدر و قیمت تھی۔ ان میں قواعد شائقین اور فوائد الفاظ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ دہلی میں رسائل کی اشاعت کا سلسلہ ۱۸۴۷ء سے شروع ہوا۔ "خیر خواہ ہند" کے نام سے ایک پرچہ ماسٹر رام چندر کی نگرانی میں نکالا گیا اور وہی اس رسالے کے ایڈیٹر بھی تھے۔ محققین کی رائے کے مطابق "خیر خواہ ہند" اردو کا پہلا رسالہ تھا جو کہ ستمبر ۱۸۴۷ء کو شمالی ہند میں دہلی سے جاری ہوا۔ یہ ایک علمی و ادبی ماہنامہ تھا جو انگریزی ماہ کی پہلی تاریخ کو نکلتا تھا۔ امداد صابری اس پرچے کے بارے میں رقم طراز ہیں :

"بقول ڈاکٹر ابواللیث صاحب صدیقی خیر خواہ ہند، پہلا رسالہ ہے جو اردو زبان میں پروفیسر رام چندر صاحب نے نکالا تھا۔ وہی اس کے مضمون کے لکھنے والے تھے۔ ان کی عادت تھی وہ کوئی مضمون اپنے قلم سے نہیں لکھتے تھے مگر ان کے طلباء جو عربی کی اول جماعت کے تھے وہ کہتے جاتے تھے، اس کو لکھتے جاتے تھے۔"

(امداد صابری: تاریخ صحافت جلد اول ص ۳۱۴)

"خیر خواہ ہند" کا نام دو نمبروں کی اشاعت کے بعد "محب ہند" رکھ دیا گیا۔ ایسا اس لیے کیا گیا کیوں کہ مرزا پور سے پہلے ہی اس نام کا ایک اخبار جاری تھا۔ اس پرچے کا صرف نام ہی بدلا گیا باقی وضع وہی رہی مثلاً اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر ہی رہے۔ صفحات میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں کی گئی اور قیمت بھی پرانی ہی رہی۔ تھوڑے دنوں بعد یہ رسالہ دہلی کالج کے پریس مطبع العلوم میں چھپنے لگا۔ اس پرچے کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس میں بڑے مفید اور جامع تاریخی، علمی، و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔

دہلی میں جس وقت اردو رسائل کا آغاز ہوا اس وقت عوام کا ذہن قطعی تعلیم کی طرف مائل نہیں ہوا تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی صرف مذہب اور کچھ حد تک ادب سے دلچسپی تھی اس لیے جو بھی اخبار یا رسالہ جاری ہوتا' اس میں مذہب کی تبلیغ حد درجہ ہوتی تھی لیکن مذہب کے ساتھ ساتھ ادبی' علمی اور سیاسی باتوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ زیادہ تر اخبارات و رسائل کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی اس لیے وہ ان کے خلاف کھل کر نہیں لکھ پاتے تھے اگر انگریز اور نواب کسی رسالے یا اخبار کو اپنا تعاون دینا بند کردیتے تھے تو وہ بند ہوجاتا کیوں کہ اخبارات و رسائل عوام میں مقبول نہیں ہوتے تھے۔ انھیں ملک کے سیاسی و ادبی رجحانات سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو بس دلچسپ واقعات پر مبنی قصوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کا یہ وہ عہد تھا جب وہ اپنی تہذیب کے ساتھ مذہب کو بھی مقبول بنانا چاہتے تھے۔ چناں چہ "خیر خواہ ہند" کے تقریباً پچیس شمارے ایسے جاری ہوئے جن کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ ان شماروں کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ اس نئی جنس کے رواج کے لیے زمینداروں میں انگریزوں کے امداد یافتہ خیر خواہوں نے سرعت سے اثر قبول کرنے والے ہندوستانیوں میں اپنی مساعی شروع کیں۔ ان کے جواب میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں دوسرے طبقوں نے بھی مذہبی رسالے جاری کیے۔ اس طرح اردو کی مجلاتی صحافت ملک کی مذہبی اور تہذیبی اشاعت میں مصروف رہی۔

مذہبی و سیاسی رسائل کے علاوہ ایسے رسائل بھی شائع ہونے لگے تھے جن کا مقصد عوام میں علمی' سائنسی اور ادبی بیداری پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ہی یورپی علوم و ادبیات سے عوام کو آگاہ کرنا بھی تھا۔ ان رسائل کے صفحات میں تاریخی واقعات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس طرح کے رسائل میں "محب ہند' فوائد الناظرین' قرآن السعدین" اور "تحفتہ الحدائق" وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ رسائل دہلی کالج کے اساتذہ کے اہتمام میں شائع ہوتے تھے اور ان کے مضامین کی نگرانی کالج کی ایک کمیٹی کرتی تھی۔ ان رسائل کی اشاعت سے پہلے تمام چھپنے والے مضامین کالج کے شعبۂ عربی کے اول اور دوئم مولویوں کو دکھلائے جاتے تھے۔

ان رسائل میں دیگر معلومات کے علاوہ دہلی کی مقامی خبریں' بہادر شاہ ظفر کی صحت کا

حال، قلعے کی سیاست، مشاعرے، دہلی کی ادبی جماعتوں کی سرگرمیاں، سوسائٹیوں کے کارنامے، اسکولوں کالجوں کی پیش رفت، دہلی کی میونسپل کمیٹی کی ہفتہ وار میٹنگوں کی تفصیل، اس وقت کی دلی کا حال، دہلی کے علماء، فنکار اور اہل صنعت سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ دہلی کی بڑی سے بڑی شخصیت ان کی تنقید کا نشانہ ہوتی تھی اور اس پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ اس کی زندگی کے خراب پہلوؤں کو بھی دنیا کی نظروں کے سامنے پیش کرتے۔ اس مطالعے سے صاف ظاہر ہے کہ دہلی میں شائع ہونے والے رسائل میں نہایت صحت مند صحافت ابھر کر سامنے آئی۔

۱۸۶۷ء میں دہلی سوسائٹی کے نام سے دہلی میں ایک تنظیم قائم ہوئی جو کہ ایک علمی و ادبی جماعت تھی۔ یہ ماسٹر پیارے لال آشوب کی قائم کردہ سوسائٹی تھی۔ اس سوسائٹی کے تحت باقاعدہ میٹنگیں ہوا کرتی تھیں جس کی روداد کو شائع کرنے کے لیے ایک رسالہ ۱۸۶۷ء میں "رسالہ دلی سوسائٹی" کے نام سے جاری ہوا۔ اس سوسائٹی کی میٹنگوں میں مضامین پڑھنے والے دہلی کے اہل حضرات ہوتے جن میں مرزا غالب، منشی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، مولانا حالی اور حکیم غلام رضا خاں دہلوی کے نام اہم ہیں۔ اس سوسائٹی کا مقصد علمی و ادبی موضوعات کو فروغ دینا تھا۔ اس سوسائٹی میں جو ادبی مضامین پڑھے جاتے ان پر بحث بھی ہوتی تھی۔ بعد میں ان مضامین کو رسالے میں چھاپ دیا جاتا۔

اردو لغات پر بھی ایک رسالہ دہلی سے شائع ہوا جس کا اجرا "ہندوستانی اردو لغات" کے نام سے ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ اس کے مالک منشی سید احمد دہلوی تھے۔

۱۸۸۲ء ہی میں "ریختہ" کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوا۔ مالک و منشی مہانرائن تھے۔ حوض قاضی سے جاری ہوتا تھا۔

شعرو سخن کے بھی متعدد رسالے جاری ہوئے جن میں "مشاعرہ" (۱۸۸۳) "مسلام" (۱۸۸۴) "جادو" (۱۸۸۵) "گلدستہ کلام" (۱۸۸۶) "زبان" (۱۸۹۳) اور "نسیم" (۱۹۰۰) منظرعام پر عام آئے۔

علمی و ادبی رسائل کے علاوہ قانونی رسائل بھی دہلی سے جاری ہوئے جن میں "قانون معاہدے کا رسالہ" کا نام سرفہرست ہے۔ اس کی سن اشاعت ۱۸۸۴ء ہے۔ یہ خالص قانونی رسالہ تھا۔ مالک مہتاب رائے وکیل تھے۔ اس رسالے سے قبل ۱۸۴۹ء میں قانونی مسائل

اور عدالتی فیصلوں پر مشتمل ایک ہفتہ وار جریدہ "فوائد الشائقین" پر بھوریال کی نگرانی میں نکالا گیا تھا۔

۱۹۰۹ء میں علامہ راشد الخیری نے خواتین کے لیے دہلی سے ماہ نامہ "عصمت" جاری کیا۔ ۱۹۱۱ء میں "تمدن" بھی راشد الخیری نے نکالا جس میں خواتین کے حقوق کی حمایت ہوتی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں "جوہر نسواں" نکلا' عزیز فاطمہ اور آمنہ نازلی اس کی مدیر تھیں۔

ساقی (مدیر شاہد احمد دہلوی) ۱۹۳۰ء میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا۔ آزادی کے بعد شاہد احمد دہلوی اس رسالے کو پاکستان لے گئے۔

آج کل۔۔۔ سرکاری رسالہ ہے۔ مختلف ادوار میں اس کی ادارت کے فرائض آغا محمد یعقوب دواشی' سید وقار عظیم' رگھوناتھ رینہ' جوش ملیح آبادی' عرش ملسیانی' مہدی عباس حسنی' شہباز حسین' راج نرائن راز' عابد کرہانی اور موجودہ مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی ہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا اور ۱۹۴۷ء تک پندرہ روزہ رہا پھر بند ہو گیا' دوبارہ پھر دسمبر ۱۹۴۷ء سے جاری ہوا لیکن اب یہ پندرہ روزہ نہیں تھا بلکہ ماہنامہ تھا لیکن پرچے پر اردو کا پندرہ روزہ باتصویر رسالہ ہی تحریر رہا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کے جنوری فروری ۱۹۴۸ء کا ایک مشترک شمارہ شائع ہوا۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد ایک شمارہ گاندھی نمبر کی حیثیت سے شائع ہوا جس پر ماہ اشاعت تحریر نہیں ہے بقیہ مدت میں رسالہ بند رہا۔

اگست ۱۹۴۸ء سے اس کا نیا دور شروع ہوتا ہے اور رسالے کو ادب و ثقافت کا حامل مصور ماہنامہ آج کل تحریر کیا جانے لگا اور اکتوبر ۱۹۴۸ء سے پتہ تبدیل ہو کر پبلی کیشنز ڈویژن' پٹیالہ ہاؤس پوسٹ بکس ۱۲۶ دہلی ہو گیا۔ تب سے یہ رسالہ آزاد ہندوستان میں حکومت کی نگرانی میں نکل رہا ہے۔

بیسویں صدی : اس پرچے کو پہلے خوشتر گرامی نکالتے تھے۔ موصوف تقسیم کے بعد اسے لاہور سے دہلی لے آئے۔ غالباً ہندوستان میں سب سے زیادہ باقاعدگی سے نکلنے والا اور سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ماہنامہ ہے۔ عوامی دلچسپی کا حامل ہے۔ آج کل اس کے مدیر رحمٰن نیر ہیں۔

تحریک : گوپال متل' مخمور سعیدی اور پریم گوپال متل کی ادارت میں شائع ہونے والے اس رسالے نے تیس سال تک تصویر کے دوسرے رُخ یعنی اینٹی ترقی پسندیت کی

ترجمانی کی۔ اس کی مجلس ادارت میں کچھ دنوں تمکین کاظمی بھی رہے۔

تخلیق : اس پرچے کو وشوناتھ درد نکالتے تھے۔ بعد ازاں وت بھارتی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ کچھ دنوں اس کی مجلس ادارت میں بانی بھی شامل رہے۔ خاصی ضخامت کے باوجود اس کی قیمت چار آنے رکھی گئی تھی۔ اس پرچے کا نئی تخلیق نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک یہ رسالہ جاری رہا۔

تلاش : اس پرچے کے بانی بھی وشوناتھ درد تھے اور انہوں نے اس کے ۱۴ پندرہ شمارہ بڑے اہتمام سے شائع کیے۔ ۱۹۶۲ء کے آس پاس انھوں نے اسے بند کردیا۔ اس پر جدیدیت کا رنگ غالب تھا۔

محور : نریندر نشچل کی ادارت میں نکلنے والا دو ماہی رسالہ تھا۔ اس کے دس بارہ شمارے ہی منظر عام پر آسکے۔ منور لکھنوی بھی اس کے شریک مدیر تھے۔ جدیدیت کی طرف میلان رکھنے والا یہ جریدہ ۱۹۶۲ء میں جاری ہوا تھا۔

تحریر : مشہور محقق مالک رام کا سہ ماہی رسالہ تھا جو کہ ۱۹۶۷ء میں جاری ہوا تھا۔ اس میں معیاری تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کی انفرادیت یہ بھی تھی کہ ہر سہ ماہی میں وفات پانے والے قلم کاروں کے بارے میں 'وفیات' کے تحت مالک رام تفصیل سے اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ یہ رسالہ مالک رام کی وفات کے ساتھ ہی بند ہوگیا۔

عصری ادب: یہ سہ ماہی رسالہ پروفیسر محمد حسن کی زیر نگرانی اور روشن آراء کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ۱۹۷۰ء سے جاری ہونے والا یہ سہ ماہی رسالہ ترقی پسند ادب کا ترجمان ہے لیکن جدید رجحانات کو بھی بلا تامل قبول کرتا ہے۔

عصری آگہی : ۱۹۷۸ء میں جاری ہونے والا یہ رسالہ قمر رئیس کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ترقی پسندیت کے ساتھ جدید اسلوب نگارش کا بھی حامی تھا۔

نیا سفر : چند سال پہلے قمر رئیس نے جاری کیا ہے۔ نئے اسالیب اور ترقی پسندیت کا ترجمان ہے۔

معیار : یہ سہ ماہی پرچہ شاہد ماہلی نے جاری کیا تھا۔ پہلے شمارے کی ترتیب میں بلراج مین را بھی شریک تھے۔ اس رسالے کے صرف چھ شمارے ہی منظر عام پر آسکے۔ اس کا مزاج بھی معتدل جدید ہی تھا۔

شعور : بلراج مین را نکالتے تھے۔ سال دو سال میں صرف ایک اشاعت منظر عام پر آتی تھی لیکن اتنی معیاری اور ضخیم کہ بے قاعدگی کی تلافی ہو جاتی۔ تاحال ہماری نگاہوں سے صرف چھ شمارے ہی گزرے ہیں۔ اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ مین را اسے خود نمائی کا وسیلہ بناتے تھے اس کے باوجود اس میں شامل مضامین و تخلیقات کی بلند معیاری پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

تناظر : بلراج ورما کی زیر ادارت نکلنے والا یہ جریدہ اعتدال پسند جدیدیت کا ترجمان تھا۔ سات آٹھ شمارے ہی نکل سکے۔ ۱۹۸۰ء میں جاری ہوا تھا۔

سطور : جدیدیت کا ترجمان یہ سہ ماہی رسالہ کمار پاشی کی ادارت میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۱ء تک جاری رہا۔ خصوصی شماروں میں نیا افسانہ نمبر۔ محمد علوی نمبر۔ سریندر پرکاش نمبر اور گوپال متل نمبر اہمیت کے حامل ہیں۔

غالب نامہ : سرکاری ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والے اس تحقیق و تنقیدی جریدے کی ادارت میں یوسف حسین خاں، نثار احمد فاروقی اور نذیر احمد شامل رہے ہیں۔ اس میں شامل زیادہ تر مضامین غالب پر ہوتے ہیں۔

کتاب نما : شاہد علی خاں کے زیر اہتمام شائع ہونے والا یہ ماہنامہ اپنے خاص نمبروں کے لیے مشہور ہے۔ اس رسالے نے ایسے نمبر شائع کیے ہیں جو ادب کی دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء سے مہمان مدیر اس کو ترتیب دیتا ہے اور وہی اداریہ کے طور پر ابتدائی مضمون تحریر کرتا ہے۔

ایوان اردو : دہلی اردو اکیڈمی سے جاری ہونے والا یہ رسالہ ۱۹۸۷ء میں نکلنا شروع ہوا۔ مخمور سعیدی اس کے مدیر ہیں لیکن سکریٹری کا نام بھی مدیر کی حیثیت سے شائع ہوتا ہے۔

اردو ادب : خلیق انجم کی ادارت میں شائع ہونے والے اس سہ ماہی رسالے کا اجراء مولوی عبد الحق کے ہاتھوں علی گڑھ میں ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں دہلی آگیا اور تاحال جاری ہے۔ یہ رسالہ خالص تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا ہے۔

یہ مختصر خاکہ محض دہلی کی صحافتی فضا کی ایک جھلک ہے۔ اس جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی نے اپنی انجمن آرائیوں اور محفل سازیوں کے ساتھ ساتھ وقت کے بدلتے

ہوئے تیور بھی پہچانے اور ع چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی' کو ذہن میں رکھ کر زمانے کا ساتھ دیا۔ یہاں پر آزادی سے قبل شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کا ذکر کرنے کے ساتھ ہم نے آزادی کے بعد شائع ہونے والے اردو کے ادبی رسائل کا تعارف بھی پیش کردیا ہے۔ اس کے علاوہ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے تقریباً تمام رسائل کی فہرست ضمیمہ کے طور پر مقالے کے آخر میں پیش کردی گئی ہے تاکہ دہلی میں آزادی کے بعد کی اردو صحافت کا خاکہ ذہن میں واضح ہوجائے۔

باب دوئم

جدید ادبی تحریکات و رجحانات
اور دہلی کے ادبی رسائل

انسان جو کچھ سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ خارجی اشیاء اور داخلی کیفیات کے تعامل سے جو نتائج اخذ کرتا ہے، اس میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش اس کی فطرت کا لازمی حصہ ہے۔ انسان نہ صرف دوسروں تک اپنے محسوسات و خیالات اور عقائد و نظریات پہنچانے کی کوشش کرتا ہے بلکہ وہ انھیں اپنا ہمنوا بھی بنانا چاہتا ہے۔ تمام فنون لطیفہ اس کی اسی کوشش کا اظہاری پیکر ہیں۔ ان میں ادب کو کلیدی اہمیت کا حامل کہا جاسکتا ہے۔ زبانوں کے زمانۂ آغاز ہی سے ہمیں ایسے ادب کا سراغ ملتا ہے جو مخصوص گروہ یا فردِ واحد کی اجتماعی و انفرادی فکر کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور جسے ہم ماقبل تاریخ کا ادب اور عوامی ادب کہتے ہیں۔

شروع شروع میں انسان زندگی اور کائنات کے متعلق تجربات و مشاہدات کی ترسیل لوک گیتوں کے وسیلے سے کیا کرتا تھا۔ بعد میں عوامی قصوں کو اس نے اپنے اعتقادات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا اور پھر عقل و شعور کے ارتقائی سفر کے ساتھ ساتھ ادب کی اصناف میں اضافہ ہوتا گیا اور انسان کو مافی الضمیر کے اظہار کے لیے نئی نئی راہیں ملتی گئیں۔ رسم خط کی ایجاد کے بعد تحریری ادب کا آغاز ہوا تو فن ابلاغ و ترسیل کے لاتعداد نئے امکانات پیدا ہوئے پھر تہذیب کے ارتقاء کے قدم بہ قدم فکرِ انسانی جوں جوں بلوغ کی منزلوں کو پہنچتی گئی۔ مذہبی، سیاسی، سماجی اور سائنسی علوم وجود میں آئے اور مختلف سطحوں پر انسانی گروہوں میں اختلافات پیدا ہوتے گئے۔ ایک گروہ دوسرے کی تنقیص و تردید کر کے اپنے فکری نظام کی اشاعت اور باقی لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے ہمعصر ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے لگا۔ زبان و ادب ازبسکہ ان وسائل نشر و اشاعت میں موثر ترین ذریعہ رہے ہیں لہٰذا ان کا استعمال بھی سب سے زیادہ ہوا ہے۔ ادب سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی خاطر چھاپہ خانہ کی ایجاد ہوئی جس کے نتیجے میں خبری و ادبی صحافت میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔ اردو کی ابتدائی

ادبی صحافت کے نقوش ہمیں ''جامِ جہاں نما'' اور ''دہلی اردو اخبار'' میں نظر آتے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ رسائل واخبارات کے اجراء کا بنیادی مقصد کسی خاص تحریک یا رجحان کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ لہٰذا اردو صحافت کے ابتدائی دور میں ایک طرف برطانوی سامراج ہندوستانی عوام کو اپنے حق میں ہموار کرنے اور یورپ کے سیاسی' سماجی اور تہذیبی رجحانات نیز عیسائیت کی اشاعت کی غرض سے رسائل واخبارات کا سہارا لے رہے تھے دوسری طرف مشرقی تہذیب کے فدائیان اور حب الوطنی کے نشے میں سرشار بھارتی عوام انگریزوں کی مذکورہ کوششوں کو بے اثر کرنے اور برادرانِ وطن میں جذبہ حب الوطنی اور آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کے لئے اسی میڈیم کو استعمال کر رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی' سرسید تحریک' شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی سماجی و مذہبی اصلاح کی تحریک' بھارت چھوڑو تحریک' گاندھیائی تحریک' ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریک نیز مختلف رجحانات کے فروغ میں اردو رسائل واخبارات کا ناقابلِ فراموش کردار رہا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم جدید ادبی تحریکات و رجحانات کے حوالے سے دہلی کے ادبی رسائل کے کردار پر مفصل گفتگو کریں' یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تحریک اور رجحان کا مفہوم کیا ہے۔

''فرہنگ آصفیہ کے مطابق تحریک کے معنی ہیں حرکت دینا' رغبت دینا' ترغیب دینا' ورغلانا' بہکانا' اشتعالک دینا' ابھارنا' سلسلۂ جنبانی کرنا' کسی بات کو چھیڑنا یا شروع کرنا' برانگیختی' سعی' کوشش ۔

(سید احمد دہلوی : فرہنگ آصفیہ' جلد اول' ناشر ترقی اردو بیورو ۱۹۹۰ء ص۔۶۰۲)

اصطلاحاً تحریک ان منظم کوششوں کو کہا جاتا ہے جو کسی فکری نظام کی ترویج واشاعت کے لیے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ چوں کہ یہ کائنات تغیرپذیر ہے' انسان اس کا ایک حصہ ہے۔ کائنات کے فطری نظام اور اس کے مابین بے شمار رشتوں کا سلسلہ موجود ہے۔ اسی لیے ہمیشہ سے وہ حیات و کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کی جدوجہد میں مصروف رہا ہے تاکہ وہ انسان اور فطرت کے درمیان رشتوں کی حقیقت و نوعیت کو سمجھ سکے اور اس تفہیم کی بنیاد پر ایک ایسے نظام کی تدوین کر سکے جو انسانی زندگی کو اس زمین پر زیادہ سے زیادہ آسان اور پر لطف بنا سکے۔ لہٰذا اسی بنیاد پر نظریات و تصورات جنم لیتے ہیں اور وہ نظریات و تصورات انسانوں کے دماغ میں پیوست ہو کر انھیں متحرک کرتے ہیں' منظم کرتے ہیں' آگے بڑھاتے ہیں۔ تاریخ

کے ارتقاء کے ساتھ تصورات بدلتے ہیں اور قدیم تصورات کی تنسیخ ہوتی ہے' نئے تصورات قائم ہوتے ہیں' یہ اس لیے ہوتا ہے کہ تبدیل شدہ سماجی ماحول میں چیزوں کو دیکھنے کے زاویے بدل جاتے ہیں۔ نکتہ ہائے نظر کی تبدیلی سے حقائق کو جانچنے کے معیار بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ قدیم تصورات یکسر ختم نہیں ہوجاتے بلکہ ان کے ماننے والوں کی ایک معتد بہ تعداد ہروقت موجود رہتی ہے اور قدیم روایات کو اسلاف کا ورثہ سمجھ کر جذباتی طور پر اس سے چمٹی رہتی ہے۔

نئے خیالات و تصورات منطقی ترتیب میں متشکّل ہو کر ایک جامع فکری نظام کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ انسانوں میں یہ فکری نظام جب بغیر کسی کوشش کے لاشعوری طور پر نفوذ کرنے لگتا ہے تو اسے رجحان کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف قدیم تصورات کے حامی اس نئے فکری نظام کی مخالفت کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کے ردِّعمل کے طور پر جدید تصورات کے شیدائی منظم ہو کر کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ خیالات و عقائد کی ترویج و اشاعت کی یہ منظم کوشش تحریک کہلاتی ہے۔ اس فکری نظام کے اثرات تمام شعبہ ہائے زندگی پر مرتب ہوتے ہیں لہٰذا ادب بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے معیار و اصول بھی ان ہی جدید نظریات و تصورات کی روشنی میں وضع ہونے لگتے ہیں اور ایک نئی طرح کا ادب وجود میں آنے لگتا ہے۔ یہاں بھی شروع شروع میں ادب کی جدید نہج پر تخلیق غیر شعوری ہوتی ہے اور تخلیق کار کو کوئی انسانی تنظیم اس بات کے لیے نہیں اکساتی ہے کہ وہ کسی خاص طرح کا ادب تخلیق کرے بلکہ وہ دوسرے لوگوں کو دیکھ کر ان کی اتباع محض جدت پسندی کے طور پر کرنے لگتا ہے لہٰذا اسے ایک ادبی رجحان کہا جائے گا تحریک نہیں۔ ہاں جب اس نئے فکری نظام سے وابستہ شعراء و ادباء ناقدین و محققین متحد ہو کر ایک تنظیم یا انجمن بنا کر اپنے نظریات اور ان کی بنیاد پر قائم کیے گئے تخلیقی اصولوں اور معیاروں کی تبلیغ کرنے لگیں' خود ان کی پابندی کریں اور دوسروں کو ان کی ترغیب دیں تو یہ منظم کوشش ادبی تحریک کہلائی گی۔

بقول ڈاکٹر انور سدید :

"رجحان کا اثر و عمل بالعلوم تیز رفتاری سے نہیں ہوتا بلکہ آہستہ روی سے لوگوں کے خیالات کو منقلب کرنے اور انھیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی مخصوص رجحان کا جادو جب معاشرے کے ایک وسیع طبقے کو اپنی گرفت میں لینے

میں کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر ایک تحریک مرتّب ہونے لگتی ہے۔"

"رجحان اور تحریک میں فرق اتنا ہے کہ رجحان زیادہ تر بے نام اور بے صورت ہوتا ہے مگر تحریک واضح خدوخال میں خود کو منکشف کرتی ہے۔ دوسرے رجحان بے سمت ہوتا ہے جبکہ تحریک تیز رفتار بہتے ہوئے پانی کی طرح کسی خاص سمت میں رواں ہوتی ہے۔ پس رجحان جس تغیّر کے لیے زمین ہموار کرتا ہے، تحریک اس کی تکمیل کے لیے جنگ لڑتی ہے اور ہر ہر نتیجے میں فتوحات کے ثمر حاصل کرنے کی سعی کرتی ہے"

(انور سدید : اردو ادب کی تحریکیں، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء ص-۱۲)

اردو کی چند اہم تحریکوں اور رجحانات پر ایک نظر

(الف) ترقی پسند تحریک :

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں برپا ہونے والے روسی کمیونسٹ انقلاب کے بعد مارکسی نظریات دنیا بھر میں مقبولیت اختیار کرنے لگے۔ اس زمانے میں چند ہندوستانی طلباء نے جو لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد مارکسی فلسفۂ حیات کو ادب کے ذریعے فروغ دینا تھا۔ اس کا نام انجمن ترقی پسند مصنّفین رکھا گیا۔ اس انجمن کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند سے کرائی گئی۔ اس کانفرنس میں انجمن کا منشور پاس کیا گیا اور اس منشور کی روشنی میں ادب کی سمت مقرر کی گئی۔ اس تحریک کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اس لیے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ اشارہ کرتے چلیں کہ آزادی کی جدوجہد میں اس تحریک نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ماحول سازگار تھا اس لئے اس تحریک کے نظریات و خیالات کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اگست ۱۹۴۷ء تک یہ اردو ادب کی مقبول ترین تحریک بن گئی۔ اردو ادیبوں کی غالب اکثریت اس سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ ہوگئی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ تقسیمِ ملک اور اس سے پیدا شدہ حالات نے متعدد مسائل پیدا کردیئے اور قلمکاروں کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔ تحریک کے کارکنان

ہندوپاک میں منقسم ہو گئے۔ پھر جس قسم کی آزادی کا خواب اس تحریک سے وابستہ افراد نے دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور بیشتر لوگ دل برداشتہ ہو کر بیٹھ رہے۔ اس طرح آزادی کے بعد یہ تحریک تنزّلی کا شکار ہو گئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہندوستانی ادیبوں نے خود کو از سرِ نو منظم کیا اور اس تحریک نے ایک بار پھر انگڑائی لی البتہ ملک کے سیاسی حالات بدل چکے تھے لہٰذا مناسب ماحول نہ ملنے کی وجہ سے اس تحریک میں پہلے جیسی بات پیدا نہ ہو سکی اور یوں تو آج بھی یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں زندہ ہے۔

(ب) انحراف کا رجحان :

جیسا کہ عرض کیا گیا' آزادی کے بعد بہت سے ترقی پسند قلمکار آزادی کے نتائج سے دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض نے تو بالکل خاموشی اختیار کر لی تھی اور بعض نے بدلتے ہوئے حالات اور نئے ماحول پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سرے سے ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادیب کے تئیں مخالفت کا رویہ اختیار کر چکا تھا۔ اس گروہ نے ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ کھڑا کر دیا اور اس انحرافی رجحان کی ترجمانی کے لیے گوپال متل کی ادارت میں رسالہ "تحریک" جاری کیا گیا۔

(ج) جدیدیت :

جدیدیت کا آغاز انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ کی سرزمین پر ہوا۔ MODERNISMO کے نام سے یہ تحریک ۱۸۸۰ء میں شروع ہوئی جس کا روحِ رواں نکاراگوا کا ایک شاعر روبن ڈاریو ROBIN DARIO تھا۔ جیسے ہی اس کی نثری و نظمیہ تخلیقات کے مجموعے منظرِ عام پر آئے' یوروپین شاعروں کا ایک بڑا طبقہ اس کی تقلید کرنے لگا۔ یہ تحریک کسی منشور یا منظم اصولوں پر مشتمل نہیں تھی بلکہ اس کا سرچشمہ دراصل وہ ردِ عمل تھا جو ایملا زولا EMILA ZOLA کی ادبی فطرت پسندی' وسیع بورژوا مطابقت اور مغربی سماج کی مادہ پرستی کے خلاف ظاہر ہوا تھا۔ جدیدیت کی تحریک MODERNISMO سے متاثر شعراء اپنے انتہائی انفرادی و وجدانی اقدار کو اظہار میں لانے کے لیے نثری شاعری اور آزاد نظم کو پسند کرتے تھے۔ ان کا شعری اسلوب حسّی تمثالوں

کی مدد سے تشکیل پاتا ہے۔ جدید اوزان اور استعارات کا استعمال انھوں نے فرانس کے علامیت پسندوں سے متاثر ہو کر شروع کیا تھا۔

یہ وہ دور ہے جب ہندوستانی ادب پر رومانوی اثرات پڑنا شروع ہوئے تھے۔ اردو ادب کی کیفیت بھی یہی تھی۔ رومانوئیت سے نجات حاصل کر کے ہمارے ادباء سماجی حقیقت نگاری کی طرف ملتفت ہوئے۔ جس زمانے میں ترقی پسندی کے زیر اثر سماجی حقیقت نگاری کا فیشن عام تھا، ۱۹۳۹ء میں ادب برائے ادب کے نعرے کے ساتھ کچھ ادیبوں نے ایک انجمن قائم کی جو حلقۂ ارباب ذوق کے نام سے مشہور ہوئی۔ میراجی، ن۔م۔راشد، انتظار حسین وغیرہ اس کے خاص وابستگان میں سے تھے۔ یہ لوگ موضوع کے بجائے اظہار پر زور دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ موضوع خواہ کیسا ہی ہو اگر اس کے اظہار میں فنی ندرت اور بلندی ہے تو وہ قابل قدر ہے کیونکہ وہ انسان کے احساسِ جمال کو جلا بخشتا ہے۔ میراجی اس طرزِ فکر و نگارش کے سب سے بڑے موئد و مبلغ تھے۔ انھوں نے مغربی جدیدیت MODERNISMO کے زیر اثر حسی پیکروں، استعاروں، اور علامتوں کے ذریعے وجودی کیفیتوں کا اظہار اپنی شاعری میں سب سے زیادہ کیا ہے۔ چوں کہ اردو میں ترقی پسندی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا لہٰذا میراجی کی طرز شاعری اس وقت کوئی مقام حاصل نہ کر سکی، لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس اردو میں جدیدیت کا آغاز ہوا تو میراجی کی شاعری نے رہنمائی کا کام کیا اور ان ہی کی شاعری کی بنیاد پر اردو میں جدیدیت کی خصوصیات متعین کی گئیں۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک اردو ادب میں جدیدیت نے بالواسطہ اور علامتی پیرائیہ بیان کو زبردست فروغ دیا۔ اس طرز اظہار میں اس قدر کشش تھی کہ پورے ملک میں اس کی حیثیت سکۂ رائج الوقت کی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ترقی پسندوں نے بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اسی پیرائیہ بیان کو اختیار کرنا شروع کر دیا۔ جدیدیت کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ترقی پسندوں نے اسے ترقی پسندیت کی توسیع کہہ کر اس دھارے میں خود کو شامل کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔

جدید ادب اپنے مشکل الفہم انداز بیان کے باعث قارئین کے اس بڑے طبقے سے دور ہوتا چلا گیا جس کی ذہنی استعداد کم تھی اور جو ہلکا پھلکا چٹ پٹا ادب پسند کرتا تھا۔ لہٰذا ۱۹۷۰ء تک آتے آتے جدیدیت پسندوں کو اپنے اسلوب میں اس حد تک تبدیلی کرنی پڑی کہ

زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ان کی رسائی ہو سکے۔ اس کے علاوہ نئے عالمی تناظر نے موضوعات میں بھی اضافہ کیا اور اس تغیر کو جدیدیت کی موت سے تعبیر کر دیا گیا۔

(د) جدید تر ادب / نیا ادب / مابعد جدیدیت / تیسری آواز کا ادب

۱۹۷۰ء تک جدیدیت کی موت کا اعلان ہو جانے کے بعد جو ادب سامنے آیا اس میں پیرایۂ بیان کسی قدر تسہیل کے ساتھ وہی رہا جو جدیدیت کا فراہم کردہ تھا البتہ موضوعات کی سطح پر یہ ہوا کہ ان میں باطنی کیفیات کے ساتھ خارجی زندگی کے عناصر بھی شامل ہو گئے۔ یہ تبدیلیاں حالات کا فطری نتیجہ تھیں۔ جو لوگ جدیدیت کو محض وجودیت اور ابہام و علائم پسندی سے تعبیر کرتے تھے انھوں نے اس تبدیلی کو نئے دور کا آغاز قرار دیتے ہوئے اسے طرح طرح کے ناموں سے موسوم کیا۔ مثلاً مابعد جدیدیت، جدید تر ادب، نیا ادب اور تیسری آواز کا ادب وغیرہ۔

اسلوب اور موضوعات کی اس تبدیلی کا پس منظر صنعتی ترقی کی تیز رفتاری، نئے عمرانی مسائل، ترسیل کا مسئلہ اور بازاری ادب کا فروغ تھا جس کی وجہ سے معیاری ادب کے تخلیق کاروں کی شناخت گم ہوتی جا رہی تھی۔ بقول محمد حسن :

> "اس پس منظر میں تحریر اور وسائلِ اظہار کی اجارہ داری کا سلسلہ آگے بڑھا۔ ریڈیو کے ساتھ سرکاری وسائل اظہار میں ٹیلی ویژن بھی آگیا اور بڑے شہروں میں اس کا چرچہ ہونے لگا۔ فلم کی دھوم دھام پہلے ہی سے موجود تھی۔ سستے اور چٹخارے دار فلمی، نیم جاسوسی اور رومانی رسالوں کا ایک جال سا پھیلنے لگا۔ خود اردو میں بھی یہ سلسلہ عام ہو گیا۔ گویا اگر کسی لکھنے والے کو مشاعرے کی واہ واہ اور سستے رسالوں کے بازاری پن سے الگ ہٹ کر کچھ لکھنا پڑھنا ہو تو اس کا جینا زیادہ محال ہونے لگا۔ شاید اسی بازادی پن کے خلاف رد عمل کے طور پر نوجوان لکھنے والا جان بوجھ کر ترسیل کے المیئے تک پہنچا۔ اسے یہ گوارا تھا کہ اس کی تخلیقات صرف وہ یا اس کے چند دوست پڑھیں مگر یہ گوارا نہ تھا کہ وہ عام چٹخارے دار گھٹیا پن کے کاروبار کی نذر ہو جائیں۔"

(عصری ادب شمارہ ۳۰، ۴۰، ص۔ ۲۳ . "تیسری آواز کا ادب")

تیسری آواز کے قلمکاروں کی خصوصیات کو عتیق اللہ نے اس طرح بیان کیا ہے :

"اس دستے میں سماجی آگہی کا شعور ہے۔ اس نے موضوع اور ہیئت کو اپنا مسئلہ ہی نہیں بنایا۔ علاوہ اس کے ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق یا جدیدیت سے اسے کوئی عناد ہے اور نہ کد موضوع اس کی خبر، اُس کا احتجاج، اُس کا رویہّ اور کا احساس ہے، اور اس کی ہیئت بھی۔ یہ رویہ نہ تو موضوع برائے موضوع کو منتج ہے نہ شاعری برائے موضوع کو، بلکہ موضوع برائے شاعری سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔ وہ ابہام جو محض گومگو کی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے یا محض قاری پر رعب ڈالنے کی غرض سے روا رکھا جاتا ہے، نئے شاعر نے بجائے اس کے اظہار میں موضوع یعنی رویہ اور ہیئت ہم وقتی مطابقت کا نام ہے۔"

(معیار شمارہ نمبر ۳ ص-۳۰)

جدید تر ادب کی شناخت کے لیے فراہم کیے گئے محولہ بالا معیاروں کے باوصف کہا جاسکتا ہے کہ جدید تر ادب اگر جدیدیت سے الگ کوئی ادب ہے تو دونوں کے بیچ کوئی واضح خط امتیاز کھینچنا مشکل ہے۔ جدیدیت آج بھی زندہ ہے اور اس سے نام نہاد جدید تر ادب کو الگ کرپانا ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی آسان کام ہے اور ترقی پسندی کے جو عناصر موجود ہیں، ان کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اب ادبی ترقی پسندی کی جو تعریفیں سامنے آئی ہیں ان میں جدیدیت کے بیشتر عناصر کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ کم از کم اسلوب بیان کی سطح پر یہ بات قطعی درست ہے۔

ذیل میں ان رسائل کا جائزہ پیش کیا جائے گا جو مذکورہ بالا تحریکات و رجحانات کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے اور دانستہ طور پر ان رجحانات کی اشاعت کی کوششیں کیں۔

(الف) "شاہراہ" اور ترقی پسند تحریک :

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کا المناک حادثہ رونما ہوا تو عوام اور خاص طور پر وہ حساس عوام جنہیں عرف عام میں تخلیق کار کہا جاتا ہے، کے خوابوں کی تعبیر جس کے حسن کا سحر ان کی تخلیقات کو عدم سے وجود میں لاتا تھا، انتہائی کریہہ شکل میں اپنے خوفناک دانت نکالے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک بھیانک تخریبی سلسلے نے ملک کے طول و عرض کو اپنی لپیٹ میں

لے رکھا تھا۔ انسانوں ہی کے بے رحم ہاتھوں سے بے لباس ہونے والی انسانیت اپنی برہنگی کو چھپانے کے لیے کسی محفوظ گوشے کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور انسان نما وحشی اس کی بے بسی و لاچاری سے محظوظ ہو رہے تھے۔ مسائل کا ایک ناپیدہ کنار سمندر تھا جس کے پانی سے ادباء و شعراء اپنی تخلیقیت کی خشک ہوتی زمین کی آبیاری کر رہے تھے لیکن ۱۹۴۹ء تک پہنچتے پہنچتے موضوعات کی یکسانیت ذہنوں پر گراں گزرنے لگی اور نتیجتاً افسانہ نگار خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اور بعض افسانے کے لیے نئی فضا کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اور اپنی اس جستجو میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن یہ نئی تشکیل شدہ فضا ان تخلیق کاروں کے لیے اجنبی رہی جو ایک مخصوص ماحول کے پروردہ تھے۔ ترقی پسند تحریک جس نے ہندوستان کو آزادی دلانے میں نمایاں رول ادا کیا تھا' تقسیم کے بعد دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھی اور بیشتر افسانہ نگار پاکستان کے شہری ہو گئے تھے۔ جن میں منٹو' غلام عباس' اختر حسین رائے پوری' احمد علی' احمد ندیم قاسمی' عزیز احمد' ممتاز مفتی' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' ممتاز شیریں' اے حمید' قدرت اللہ شہاب' ابوالفضل صدیقی' محمد حسن عسکری' شوکت صدیقی اور اشفاق احمد شامل ہیں۔ سجاد ظہیر جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے روح رواں تھے وہ بھی تقسیم کے بعد پاکستان جا کر بس گئے۔ اور اس طرح ہندوستان میں ترقی پسند تحریک تعطل کا شکار ہو گئی۔ اس تعطل کو دور کرنے اور اردو ادب کے پیکر مضمحل میں از سر نو ترقی پسندی کی لہر دوڑانے کے لیے دہلی سے ایک جریدے "شاہراہ" کا اجراء عمل میں آیا۔ سیاسی و سماجی انتشار کے اس ماحول میں ترقی پسند تحریک کے ترجمان اس نئے جریدے کا اجراء یقیناً ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ اس جریدے کے اجراء کا مقصد ساحر لدھیانوی (مدیر) اپنے اداریے میں یوں بیان کرتے ہیں !

"اس رسالے کا اجراء' جیسا کہ ظاہر ہے نہ تو کوئی' غیر معمولی حادثہ ہے اور نہ کوئی عظیم کارنامہ' اگر اس میں کوئی خوبی یا عظمت نظر آئے تو وہ اس رسالے کی نہیں بلکہ اردو ادب کی اس تحریک کی ہے۔ جس کا یہ رسالہ ترجمان ہے...

... ہمارے اغراض و مقاصد وہی ہیں جن کا اعادہ انجمن ترقی پسند مصنفین گزشتہ بارہ برس میں بارہا کر چکی ہے...

... "شاہراہ" کسی ادبی رسالے کو زک دینے یا اس پر سبقت لے جانے کے لیے نہیں جاری کیا گیا بلکہ ان رسائل کی صف میں ایک نئے جریدے کا اضافہ کرنے

کے لیے نکالا گیا ہے جو موجودہ حالات میں انسانی بہتری اور سماجی خوش حالی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم ان تمام ادیب ساتھیوں کو سلام کرتے ہیں۔ بعض کو ہماری تحریک کی بارہ سالہ زندگی میں ظلم و تشدد کا شکار ہونا پڑا اور طرح طرح کی پابندیاں اور مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

"شاہراہ" ان کا نیا ترجمان ہے اور انہیں یقین دلاتا ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے آپ کو ان سے وابستہ رکھے گا۔"

(اداریہ "شاہر" شمارہ ا جلد ۹ ۱۹۴۹ء ساحر لدھیانوی ص ۳)

جیسا کہ "شاہراہ" کی فائلوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس جریدے نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی حسب استطاعت جدوجہد کی۔ اس نے کمال بے باکی کے ساتھ ترقی پسندی کی راہ میں حائل عناصر سے نبرد آزمائی کی، اور ادب کی اشاعت کے ذریعے سماجی اصلاح اور خوش حالی کے راستے ہموار کیے۔ گرچہ قدم قدم پر مسائل بھی کھڑے ہوئے اور اقتصادی پریشانیاں بھی آڑے آئیں۔ چند ادیبوں کی سرد مہری کا شکار بھی ہونا پڑا، لیکن اس کے باوجود "شاہراہ" ۱۹۴۹ء کے دو شماروں اور ۱۹۵۷ء کے ابتدائی سات شماروں کے علاوہ تمام عمر پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

"شاہراہ کی ادارت شروع سے آخر تک قد آور شخصیتوں کے ہاتھوں میں رہی۔ اس جریدے نے ترقی پسند ادبی تحریک کے فروغ میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا اور اس وقت تک اپنے مشن کو کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار کرتا رہا جب تک کہ قلمکاروں کا تعاون حاصل رہا۔ لیکن جب ادبی فضا پر جدیدیت کا سحر پوری طرح چھا گیا تو پھر اس جریدے کو بھی حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور اس نے نئے اسالیب بیان اور نئے خیالات کو ترقی پسندی کے ساتھ ہم آمیز کر کے ایک معتدل راہ کو اپنا لیا۔ ذیل میں "شاہراہ" میں شائع ہونے والی ان تخلیقات اور مضامین کا اجمالاً تذکرہ کیا جائے گا جن سے ترقی پسند تحریک کے پژمردہ وجود میں ایک بار پھر زندگی کی رمق پیدا ہو گئی تھی۔

"شاہراہ" میں شائع ہونے والے بیشتر افسانے اردو کے نام ور قلمکاروں کی تخلیقی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن میں کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، دیوندر ستیارتھی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، گارگی، کنہیا لال کپور، کشمیری لال ذاکر، خواجہ احمد

عباس، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، کرتار سنگھ دگل، تاجور سامری، اقبال مجید، کملیشور، شوکت صدیقی، پرکاش پنڈت، حیات اللہ انصاری، بھیشم ساہنی، جوگیندر پال، قدرت اللہ شہاب، علی عباس حسینی، دیویندر اسر، انور عظیم، عادل رشید، فکر تونسوی، ہاجرہ مسرور، کوثر چاند پوری، اے حمید، غیاث احمد گدی اور واجدہ تبسم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سرلا دیوی، ہنس راج رہبر، پریم ناتھ، ملک راج آنند، شاہد لطیف، چندر کانت، ریاض روفی، صدیقہ بیگم، مرزا ادیب، نجمہ نکہت، ست پرکاش سنگھ، گوردیال سنگھ، پریم وار برٹنی، سندر سنگھ، زہرہ جمال، م۔م۔راجندر، امر سنگھ، شفیقہ فرحت، عزیز اثری، رشیدہ رضوانہ، شمشیر سنگھ چاولہ، حسن نجمی، امرت رائے، ظہور بخش، گربچن سنگھ، غلام جیلانی، ٹھاکر پونچھی، گجیندر سنگھ، محمود عزیز، افسر بجنوری، راجندر سنگھ مسرا اور حمید اختر کے افسانے بھی اس جریدے میں شائع ہوتے رہے۔ ان تخلیق کاروں نے انسان کی داخلی و خارجی زندگی کے ان موضوعات کو اپنا موضوع بنایا جن سے ترقی پسندی کو فروغ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر چغتائی نے اپنے افسانوں "کیڈل کورٹ" (شمارہ۔۱، جلد۔۱) اور "کچے دھاگے" (شمارہ۔۲، جلد۔۲) میں آزادی کے بعد ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں کے پرپیچ مسائل اور عوامی اتحاد کو موضوع سخن بنایا ہے۔ کرشن چندر نے "مہالکشمی کا پل" (شمارہ ا جلد ا) "بہار کے بعد" (شمارہ ۲ جلد ۱) "واثق" (شمارہ ۱۱ جلد ۱) "طوفان کی کلیاں" (شمارہ ۱۲، جلد ۳، ۴) "دہلی کے دائرے" (شمارہ ۳، ۴، جلد ۱) "برہم پترا" (شمارہ ۱، ۲ جلد ۲) "میں انتظار کروں گا" (شمارہ ۳، ۴ جلد ۳) "مونگ کی دال (شمارہ ۴ جلد ۳) "بارود اور جیری کے پھول" (شمارہ ۵، ۳ جلد ۳ "ہوا کے بیٹے" (ش ۵ ج ۷) "چاول چور" (شمارہ ۶، جلد ۴) "مرا دوست" (شمارہ ۱۲، ج ۲) "موم کی چٹان" (شمارہ ۱، ۲ جلد ۵)، عوام کے داخلی و خارجی زندگی کے ترجمان ہیں، آزادی کی خواہش، تقسیم کے بعد چاروں طرف پھیلی ہوئی ابتری، بھوک، بیکاری، اور ظلم و استحصال کے موضوعات کو انھوں نے انتہائی خوبصورتی سے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور عوام میں ظلم و ناانصافی کے خلاف صف آرا ہونے کا جذبہ پیدا کرنے اور انہیں آزادی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے افسانہ "بھیک" (شمارہ ۶، جلد ۷) میں ایک بے سہارا لڑکی اور اس کے پانچ بھائیوں کی روداد موثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ خواجہ احمد عباس کے افسانے

اس جریدے میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانے سماج کے نچلے متوسط اور پسماندہ طبقات کے پیچ در پیچ مسائل کے کامیاب عکاس ہوتے ہیں۔ "بھارت ماتا کے پانچ روپ" (جلد ۹ شمارہ ۹)' دیوار کے پاس۔(جلد ۳' شمارہ ۵'۴)' نئی برسات (جلد ۱ شمارہ ۳'۴)' دھند کی زنجیر" (جلد ۱ شمارہ ۱)' جاگتے رہو" (۱ر۲)' "چراغ تلے اندھیرا (۲ر۲')' چار داسوں کی کہانی (۳ر۹) "بوائے" (۶ر۱ ۲) اسی انداز کی کہانیاں ہیں جن میں دبے کچلے عوام کی زندگی اپنے تمام تر کرب و کیف اور نشیب و فراز کے ساتھ موجود نظر آتی ہے اور قارئین کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے تین افسانے "شاہراہ" میں شائع ہوئے۔ ان کا افسانہ کنواری (۴ر۵) تقسیم ملک سے پیدا شدہ بحران کی شکار ہونے والی ایک معصوم لڑکی کی سرگزشت ہے۔ "سپاہی کا بیٹا" (جلد ۲ ش ۱۲) دوسری جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے انتشار کی تصویر کشی کرتا ہے۔ "گنڈاسا" (۴ر۶) ایک ایماندار اور پر خلوص انسان کی کہانی ہے۔

انور عظیم کے افسانے "ہیروں کا ہار" (۲ر۸) اور "کوچ" (جلد ۷ شمارہ ۱'۲) انسانی آزادی اور حقوق کی حمایت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کا افسانہ "گناہ کی بیٹیاں گناہ کے باپ" جلد ۳ ۴ شمارہ ۱۲') میں صدر پاکستان کے ذریعے عورتوں کی جسم فروشی کو قانوناً ممنوع قرار دینے پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور اس قانون کے نتیجے میں عورتوں کے طبقے کی بے بسی کا اظہار کیا گیا ہے۔

غیاث احمد گدی اپنے ماحول کی عکاسی بڑے فطری انداز میں کرتے ہیں انہوں نے اپنے افسانوں "چٹان" اور "رام او تار" (اگست ۵۴ء) میں غریب اور مخلص انسانوں کے عزم کی سرگزشت اور پسماندگی کی وجوہات نیز افلاس زدہ زندگی کے کریہہ چہرے سے نقاب اٹھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

"اسّی گنی بھو کے عیب" (۴ر۱)' "افکاری" (۵ر۴)' "مرد عورت" (۵ر۳'۴) مصنفہ رشید جہاں)' "جھیلوں کی سرزمین" (۲ر۹) "دیوداسی" (۲ر۲'۳)' "غم دل اگر نہ ہوتا" (۲ر۱'۳) مصنفہ شوکت صدیقی' "ریشم کا دل" (۴ر۲'۳) "سنگ کافی" (۴ر۷) دیویندر اسر' "جنم بھومی" (۱ر۳'۴) "ووٹ" (۴ر۶) "گھونسلے" (۴ر۹) "مٹھی میں لکھنؤ" (۴ر۵) مصنفہ

دیوبندر ریتار تھی۔ "محافظ الملک" (۲،۳،۴) خدیجہ مستور "مدوجزر (۴؍۱۱)" "مٹی کی گڑیا (۵؍۵،۶)"، "نیم کا درخت" (۸؍۵) رضیہ سجاد ظہیر، "گھورے کا پھول" (۶؍۱۱) ہاجرہ مسرور، "الوداع" (۱؍۱۱) ہنس راج رہبر، "پاگل خانے" (۱۲؍۶) جوگیندر پال وغیرہ افسانے سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ زندگی کے تیئں مثبت انداز فکر اپنانے کی ترغیب اور مصائب و آلام سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

۱۹۵۶ء میں اعظم گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس سے قبل موضوعات کی یکسانیت نے ترقی پسند ادب میں ایک طرح کا جمود پیدا کر دیا تھا اور اس کے مطالعے سے اب اکتاہٹ اور بیزاری ہونے لگی تھی۔ یوسف جامعی نے "کس حال میں ہیں" کالم شروع کر کے ادباء و شعراء کو اس یکسانیت کا احساس دلانے کی کوشش کی لیکن انحطاطی ادب اور جریدے کی مالی دشواریوں کا مسئلہ حل نہ ہو سکا لہٰذا جون ۱۹۵۳ء کو یوسف جامعی نے دفتر "شاہراہ" میں ایک مشاورتی نشست کا اہتمام کیا جس میں انور عظیم، شکیل الرحمٰن، ہنس راج رہبر، شاذ تمکنت، نریش کمار شاد، اور غلام ربانی تاباں نے شرکت کی اور معیاری ادب کی تخلیق کے لیے فنکاروں کو اکسانے کی خاطر کچھ نئے ادارتی کالم شروع کرنے کا مشورہ دیا اور یوں نومبر ۱۹۵۳ء سے تین کالموں کا اضافہ ہوا۔ (۱) "ہم سخن فہم ہیں" (۲) "کھلی چٹھیاں" (۳) "میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔"

ظ۔ انصاری جون ۱۹۵۴ء میں مدیر ہوئے تو انھوں نے مزید تبدیلیوں کے ذریعے "شاہراہ" کو معیاری بنانے کی کوشش کی اور ایسے مضامین بھی شائع کرنا شروع کیے جو اگرچہ ادب سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے لیکن ان سے تفہیم ادب میں کسی نہ کسی طرح مدد ضرور ملتی ہے۔ مثلاً :

ہمارا ناچ اور انسانی تخیل	ملک راج آنند	جون ۱۹۵۴ء
کتھک ناچ کا فنی حسن	محمد حسن	جولائی ۱۹۵۲ء
راگوں کے روپ	افضل پرویز	ستمبر اکتوبر ۱۹۵۴ء
ڈوگرہ پہاڑی آرٹ	وید راہی	ستمبر اکتوبر ۱۹۵۴ء
مصوری پر دو باتیں	رام کمار	نومبر ۱۹۵۴ء
ہندوستانی آرٹ	ظ۔ انصاری	دسمبر ۱۹۵۴ء

ان تحقیقی مقالوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی ذہنی ارتقاء میں موسیقی اور مصوری نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔

ظ۔ انصاری کے زمانہ ادارت میں نئے قلمکاروں کو خاص طور پر موقع دیا گیا تاکہ ترقی پسند انداز فکر کے مطابق ان کی ادبی تربیت ہو سکے لہٰذا یہ فیصلہ ترقی پسند تحریک کے مفاد میں تھا۔ اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا کہ ان نئے قلمکاروں میں سے کئی ترقی پسند تحریک کے مخلص اور وفادار بن گئے۔ اور انہوں نے بھی ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں انفرادی و اجتماعی طور پر اہم کردار ادا کیا۔ مثلاً جیلانی بانو، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، عمیق حنفی، شفیق فاطمہ، بلراج مین را، قمر رئیس، ظفر پیامی، شاذ تمکنت، قاضی سلیم اور من موہن تلخ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اسی جریدے سے کیا۔

ادب کو نیا موڑ دینے کی غرض سے ظ۔ انصاری نے ایک قدم یہ اٹھایا کہ ایلیہ ایرن برگ، تایا فوسکی، ممتاز حسین اور محمد حسن کے وہ مقالے شائع کیے جن سے نئی حقیقت نگاری (منفی و مثبت رویہ) کی اہمیت کا احساس ہوا۔

"شاہراہ" میں شائع ہونے والے مضامین یوں تو سبھی اپنی اپنی جگہ ترقی پسند طرز تنقید اور غور و فکر کو جلا بخشتے ہیں لیکن ذیل میں ان مضامین کی فہرست دی جا رہی ہے جن سے ترقی پسند تحریک کو نہ صرف قوت و استحکام حاصل ہوا بلکہ وہ کچھ نئے ابعاد سے بھی ہمکنار ہوئی :

روپ بہروپ	محمد حسن	مئی ۱۹۵۰ء
آندھی میں چراغ	صابرہ زیدی	جون ۱۹۵۰ء
انداز بیان کے بارے میں	محمد حسن	اگست ۱۹۵۱ء
نیا ادبی فن	ممتاز حسین	فروری۔ مارچ ۱۹۵۱ء
ادب میں تنگ نظری	سیدہ یحییٰ	اپریل ۱۹۵۲ء
ادیب اور اس کا فن	ممتاز حسین	جنوری ۱۹۵۵
وجود پرستی کا فلسفہ اور اس کا طبقاتی مفہوم	بدیع مشہدی	جولائی ۱۹۵۱ء
حقیقت نگاری	ممتاز حسین	اگست ۱۹۵۴ء
فن اور پروپیگنڈہ	ج۔ ر۔ ساہنی	اکتوبر ۱۹۵۵ء

نئی تنقید | علی جواد زیدی | فروری ۱۹۶۰ء
رومان سے انقلاب تک | ہنس راج رہبر | ستمبر ۱۹۶۰ء

یہ مضامین ترقی پسند تنقید کو فروغ دینے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے پریم چند، عبدالحق اور اینگلز کے تصورات، مثلاً

- اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا۔ پریم چند۔
- اعلیٰ کلاسیکی ادب کا عمیق مطالعہ کرکے اس کے صحت مند عناصر کو اخذ کرنا۔ عبدالحق
- مصوری اور زندگی و سماج کے لیے مفید مواد کو فنی ضابطوں کا احترام کرتے ہوئے بے ساختہ اور غیر محسوس انداز پر پیش کرنا۔ اینگلز۔

وغیرہ کو نظر انداز کرکے ترقی پسند ادبی تحریک کو زک پہنچائی۔ بھمڑی کانفرنس کے بعد یہ تحریک جس تنزلی کا شکار ہوئی تھی اس کو دور کرنے میں یہ مضامین کافی حد تک معاون ثابت ہوئے۔ موضوعات میں تنوع، فنی اقدار سے واقفیت اور ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں ان مضامین نے بہت مدد کی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی ترقی پسند ادیبوں کی نگارشات کے ترجموں نے بھی ترقی پسندی کے صحیح تصور کے تعین میں مدد دی۔ ان تراجم نے ترقی پسند ادباء کے ذہنوں میں پیدا شدہ اشتباہات کو دور کرنے کا کام کیا۔

- ادب کی نئی حقیقت نئے فرض | ساون فسکی | جولائی ۱۹۵۴ء
- ادیب اور اس کا فن | ایلیا ارین برگ | جون ۱۹۵۴ء

جیسے مضامین نے ترقی پسند قلمکاروں کے نقطۂ نظر میں توازن قائم کیا۔

"شاہراہ" میں عملی تنقید کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں جنھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات کو صحیح سمت عطا کی۔ نظیر اکبر آبادی، مومن، اکبرالہ آبادی، حسرت موہانی، اقبال، پریم چند، کرشن چندر، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، کلیم الدین احمد، قرۃ العین حیدر، بلراج کومل اور سعادت حسن منٹو کی نگارشات پر جو تنقیدی مضامین شائع ہوئے ان کی اہمیت اردو کی عملی تنقید میں مسلم ہے۔ علاوہ ازیں اردو کی مختلف اصناف سخن کے فنی پہلوؤں اور ان کی عہد بہ عہد خدمات اور مختلف رویوں پر شائع ہونے والے مندرجہ ذیل مضامین بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں :

اردو شاعری کے جدید رجحانات | عبادت بریلوی | شمارہ ۳، ۴۔ ۱۹۴۹ء

جدید اردو شاعری	محمد حسن	فروری-مارچ ۱۹۵۱ء
کچھ ادب کے بارے میں	دیویندر اِسّر	جنوری ۱۹۵۳ء
اردو ادب کا جدید دور	احتشام حسین	اگست ۱۹۵۵ء
تقسیم کے بعد ناول	وقار عظیم	ستمبر ۱۹۵۷ء
آج کا اردو ڈرامہ	سجاد ظہیر	جون ۱۹۵۸ء
آزادی کے بعد اردو ادب	مسیح الزماں	نومبر ۱۹۵۸ء
اردو کی جدید تصویر	عبدالعلیم	مئی ۱۹۶۰ء
ناول کی تکنیک	مسیح الزماں	مارچ ۱۹۵۵ء
تکنیک (غزل)	ممتاز حسین	جنوری فروری ۱۹۵۳ء
کچھ غزل کے بارے میں	اعجاز حسین	فروری ۱۹۵۳ء
غزل اور نظم	اعجاز حسین	جولائی ۱۹۵۱ء

ہندوستان کی کلاسیکی روایات اور صحت مند اقدار سے اور ان کے مخفی گوشوں سے آگاہ کرنے میں ان تحقیقی مقالوں نے بہت مدد پہنچائی جو وقتاً فوقتاً "شاہراہ" کے صفحات کی زینت بنتے رہے۔ ان تحقیقی مقالوں میں حسب ذیل خاص طور پر اہم ہیں :

اردو صحافت کا ابتدائی دور	قاضی عبدالغفار	ستمبر ۱۹۵۰ء
پنچ تنتر	ہنس راج رہبر	ایضاً
حیات خواجہ میر درد	امداد صابری	فروری ۱۹۶۰ء
ہندوستانی تھیٹر کا ارتقاء	عبدالعلیم نامی	مئی ۱۹۵۸ء

پریم چند اور سجاد ظہیر کی حیات اور شخصیت پر بھی اس جریدے میں وقتاً فوقتاً مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جولائی ۱۹۵۰ء سے پرکاش پنڈت نے "ہم سفر" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جس میں فکر تونسوی، بلراج کومل، احمد ندیم قاسمی، سجاد ظہیر اور کمال احمد صدیقی، کے مشاغل اور ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ سلسلہ نومبر ۱۹۵۱ء تک جاری رہا۔ ایک سلسلہ یوسف جامعی نے ۱۹۵۹ء سے شروع کیا جس میں جدید شعراء کی تخلیقات کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ اس سلسلے کے تحت جگن ناتھ آزاد، ناصر کاظمی، قتیل شفائی، نریش کمار شاد، احمد ریاض اور شاذ تمکنت کے فن پر شکیل الرحمٰن نے مضامین لکھے۔

انجمن نے اپنی ۱۹۳۶ء کی کانفرنس کے منشور کو مد نظر رکھتے ہوئے جن چھ تجاویز کو منظور کیا تھا ان میں سے مندرجہ ذیل پر بڑی حد تک شاہراہ نے عمل کیا :

۱ اظہار خیال اور فکر و نظر کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

۲ ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا۔

۳ ترقی پسند ادیبوں کی معاونت کرنا۔

"رفتار" کے عنوان سے ابتداءً غیر ملکی ترقی پسندوں کی نگارشات کے ترجمے باقاعدگی سے "شاہراہ" میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ میکسم گورکی اور چیخوف کے افسانوں کے تراجم بھی اس جریدے میں شائع ہوتے رہے جن کی مدد سے اردو کے ادیبوں نے ترقی پسندی کے اصولوں پر افسانے لکھنے کے لیے نئے نئے اسالیب کی واقفیت حاصل کی۔ جس سے اردو میں ترقی پسندی کو یقیناً فروغ حاصل ہوا اور یہ فروغ ترقی پسند تحریک کا فروغ تھا۔

ترقی پسند تحریک ایک آئیڈیولوجی پر مبنی تحریک تھی۔ اور کسی آئیڈیولوجی کے شعری اظہار کے لیے نظم موزوں ترین ذریعہ ہے کیوں کہ اس میں خیالات کو ایک مربوط شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے زندگی اور سماج کو ترقی پسند نقطہ نظر سے شعری پیکر عطا کرنے کے لیے شعراء نے نظم کا سب سے زیادہ استعمال کیا۔ اور ساتھ ہی غزل کو بھی زمینی حقائق سے ہم آغوش کیا۔ نظیر اکبر آبادی نے جس شعری اسلوب کی بنیاد ڈالی تھی اس کو ترقی پسند شعراء نے مزید وسعتیں عطا کیں۔ کیا مضامین اور کیا ہیئت و تکنیک ترقی پسندوں نے دونوں اعتبارات سے اردو نظم کو بلندیوں سے ہمکنار کیا اور "شاہراہ" نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں اس رسالے نے بیحد اخلاص کا مظاہرہ کیا۔ ثبوت کے طور پر یہ نظمیں دیکھیے :

شام اودھ	خلیل الرحمٰن اعظمی	جنوری۔ فروری ۱۹۵۰ء
میرے حسین خداؤ	خلیل الرحمٰن اعظمی	مئی ۱۹۵۰ء
معصومیت کے نام	بلراج کومل	دسمبر ۱۹۵۰ء
کونپلیں	ایضاً	مارچ۔ اپریل "
یہ لوگ	بلراج کومل	اکتوبر ۱۹۵۱ء
ارتقاء	وحید اختر	دسمبر ۱۹۵۲ء

موسم کا تغیر	حامد عزیز برنی	فروری-مارچ ۱۹۵۲ء
جان شیریں	اختر الایمان	مئی ۱۹۵۳ء
زادِ راہ	وحید اختر	جنوری- فروری ۱۹۵۴ء
شہر آشوب	منیب الرحمٰن	اپریل ۱۹۵۴ء
نیا بنجارہ نامہ	اشک امرتسری	جولائی ۱۹۵۴ء
اودھ کی خاک حسین	علی سردار جعفری	فروری مارچ ۱۹۵۱ء
سنگم	نریش کمار شاد	مئی ۱۹۵۸ء
شورش بربط و نئے	فیض احمد فیض	مارچ اپریل ۱۹۴۹ء
زنداں کی ایک صبح	ایضاً	جنوری فروری ۱۹۵۳ء
شہریاراں	ایضاً	فروری ۱۹۵۴ء
آہنگ انقلاب	ساحرلدھیانوی	مارچ اپریل ۱۹۴۹ء
نیا پرچم	سلیمان اریب	ستمبر تا دسمبر ۱۹۴۹ء
ہمالہ کی گہرائی میں نہ جاؤ	سلام مچھلی شہری	جنوری فروری ۱۹۴۹ء
بس درشن درشن میرا	میراجی	جنوری فروری ۱۹۴۹ء
آب و گل	شاذ تمکنت	جون ۱۹۶۰ء
ایک حقیقت	ندا فاضلی	اگست ۱۹۵۹ء
شہر آرزو	باقر مہدی	ستمبر ۱۹۵۷ء
انتظار ابھی اور	راہی معصوم رضا	مئی ۱۹۵۱ء
آزادی	رفعت سروش	جنوری فروری ۱۹۵۰ء
فنکار	عمیق حنفی	ستمبر ۱۹۵۸ء
کاغذی پیرہن	خلیل الرحمٰن اعظمی	جنوری ۱۹۵۴ء
خامہ خوں چکاں	قاضی سلیم	ستمبر ۱۹۵۹ء

یہ نظمیں نہ تو خشک نعرے بازی یا پروپیگنڈہ بازی کا اسلوب رکھتی ہیں اور نہ ہی ان میں سطحی حقیقت نگاری ہے بلکہ ان میں فرد اور معاشرے کے تعلقات اور ان کے باہمی تصادمات کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ بعض میں براہ راست تخاطب کا انداز بھی

ملتا ہے لیکن فنی ضابطوں کے احترام اور اپنی صحت مند روایات کی پاسداری کے ساتھ۔ موضوعاتی و اسلوبی یکسانیت کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔

"شاہراہ" کی غزلوں نے بھی ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد کی۔ یہ تحریک چوں کہ غزل میں رجائی لہجے اور معاشرے کی طبقاتی کشمکش کو ضروری جانتی ہے لہٰذا "شاہراہ" میں ایسی غزلوں کی تعداد خاصی ہے۔ اس سلسلے میں اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، شاد عارفی، شکیل بدایونی، فیض احمد فیض، فراق، جذبی، مجروح، نریش کمار شاد، شاذ تمکنت، اختر انصاری، سلام مچھلی شہری، ظہیر کاشیری، حبیب الرحمٰن، سلیمان اریب، نیاز حیدر، بشر نواز، کیف بھوپالی، شہریار، باقی صدیقی، باقر مہدی، عارف عبدالمتین، جمیل ملک اور زبیر رضوی کی غزلیں پیش کی جاسکتی ہیں جو شاہراہ کے مختلف شماروں میں چھپی ہیں۔

دیگر اصناف نے بھی "شاہراہ" کے صفحات پر جگہ حاصل کر کے ترقی پسند تحریک کے فروغ میں حصہ لیا۔ "شاہراہ" نے ترقی پسند تحریک کو اس کا کھویا ہوا مقام دلانے کی جو جدوجہد کی اس کا ثبوت اس کی نگارشات ہیں۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے منظوم ڈرامے، نثری ڈرامے، انشائیے، طنز و مزاح، خاکے، رپورتاژ اور سفرنامے سبھی کا مزاج ترقی پسندیت لیے ہوئے ہے لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ ان کے ذریعے دوسرے ادیبوں کو بھی اس طرز نگارش کو اختیار کرنے کی ترغیب ملی ہوگی اور اس طرح ترقی پسند تحریک کو مقبولیت کا درجہ دینے کا یہ نگارشات سبب بنی ہوں گی۔ نگارشات کے ذریعے ترقی پسند انداز تخلیق کو عام کر کے تحریک کو کامیاب کرنے کے علاوہ "شاہراہ" نے تنظیمی سطح پر بھی براہ راست بہترین خدمات انجام دیں اور اس طرح فروغ انجمن میں معاون ہوا جس کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

"شاہراہ" نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی سرگرمیوں سے باخبر کرتے رہنے کا فریضہ بھی بحسن و خوبی انجام دیا۔ انجمن کی کانفرنسوں کی مفصل رودادیں، اطلاعات، کارکنان کی پریشانیوں، جیلوں سے بھیجے گئے خطوط، اعلان نامے، مخالفتوں کے جوابات، ادیبوں اور شاعروں سے تحریک میں حصہ لینے کی اپیلیں، حکومت کے تحریک مخالف اقدامات پر احتجاج، تحریک کے کارکنان کا احتساب اور اصلاح، بدلتے ہوئے حالات میں تحریک کا رخ متعین کرنے کے لیے مشورے غرض ہر قسم کا تنظیمی مواد اس میں شائع ہوا ہے۔ جو کہ تحریک کو چلانے میں بہر طور پر معاون رہا۔

(ب) ترقی پسند تحریک اور ''عصری ادب''

ترقی پسند ادبی تحریک پر ایک دور وہ بھی آیا کہ اس میں زندگی کے آثار مفقود نظر آنے لگے۔ اس سے منسلک افراد میں پہلے جیسا جوش اور ولولہ باقی نہ رہا۔ تحریک کو محض سیاسی روشنی میں دیکھنے والے اس کے ادبی و فنی پہلوؤں سے چشم پوشی کرنے لگے اور خالص نعرے بازیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ اس تیرگی میں ڈاکٹر محمد حسن نے ''عصری ادب'' کا اجراء کر کے ایک چراغ روشن کردیا۔ اس جریدے نے ترقی پسند تحریک کے خشک ہوتے ہوئے پودے کو ایک بار پھر سے شگفتگی عطا کرنے کی کوشش کی۔

''عصری ادب میں شائع ہونے والے ادب کے ذریعے مائل بہ خواب ضمیروں کو نئی بیداری اور قلمکاروں کو ادب کی برتری کا احساس ہوا۔ اس رسالے نے قلمکاروں کو ان کی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کرائی، سماجی مسئلوں کو موضوع سخن بنانے کی تلقین کی، ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھائی اور قارئین کو حق کے لیے محاذ آرا ہونے کی تدابیر بتائیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے ترقی پسند تحریک کو فروغ حاصل ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے بنیادی منشور پر عمل پیرا ہونے کا بھی ادیبوں کو مشورہ دیا۔ مثلاً یہ مضامین :

ادیب اور سماج کے باہمی تعلقات پر ایک نظر	محمد حسن	شمارہ ۱۱۔ ۱۲
عقل دشمنی سے ادب کے تحفظ کا مسئلہ	ایضاً	شمارہ ۵۴
ادیب اور دانشوروں کا رشتہ سماج سے کیوں کر ہو	ایضاً	۱۳۔ ۱۴
ادب سیاست کے آگے مشعل لے کر چلنے کی سچائی ہے	ایضاً	۵۵
ادب اور ادبیت اور مارکسزم ایک جائزہ	سری نواس لاہوتی	۲۵۔ ۲۶
ادب میں نظریے کی اہمیت	محمد حسن	۲۱۔ ۲۲
ادبی سماجیات	محمد حسن	شمارہ ۵۳

ادبی ضمیر کی خریداری : ایک مذاکرہ	شرکاء	
بعنوان ادب کا نیا سیاق و سباق	ڈاکٹر عطر سنگھ 'ایس این تواری'	
	بلراج مین را' صدیقی الرحمٰن قدوائی'	
	فضل الحق	شمارہ ۷
پاکستانی ادب کی دو آوازیں	محمد حسن	۵۴

عصری ادب نے ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے کے لیے ان تمام نظریات اور اصول و ضوابط کا اعادہ کیا جن پر تحریک کی بنیاد تھی۔ ادب کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے اس پر مذاکروں اور مضامین کے ذریعے عصری ادب قارئین تک معلومات بہم پہنچاتا رہا۔ تحریک کا ایک مقصد ملک میں فرقہ واریت کے خلاف محاذ قائم کرنا بھی تھا۔ اس رسالے نے اس طرف توجہ دی اور فرقہ واریت پر متعدد اچھے مضامین اور افسانے و نظمیں چھاپیں۔ فرقہ پرستی کے انسداد کے لیے ادیبوں کو متحرک کیا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ مختلف قسم کے تعصبات جو ہمارے ملک کی فضا کو مسموم کر رہے ہیں' کو اپنا موضوع بنائیں۔ ذیل کے مضامین اس کی مثال ہیں :

فرقہ واریت پر ایک نظر	تقی رحیم	شمارہ ۵۲
وسطی ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فرقہ واریت	ہربنس مکھیا' امیر اللہ شاہین	
فرقہ وارانہ فساد کیوں	سری نواس لاہوتی	" ۶
فرقہ واریت اور قدیم ہندوستانی تاریخ نویسی	رومیلا تھاپر / محمد حسن	" ۲
دور جدید کی ہندوستانی تاریخ نویسی میں فرقہ واریت	بپن چندر / محمد ذاکر	" ۵
سیکولرزم کی تاریخ اور اس کا جائزہ	سید سبط حسن	" ۵۴
خون دل کی کشید	محمد حسن	" ۱

ان مضامین کے علاوہ اداراتی کالم "آڑے ترچھے آئینے" کے تحت فرقہ واریت پر محمد حسن (مدیر) کے فکر انگیز خیالات اور مختلف شہروں میں ہونے والے فسادات کی رپورٹیں اور تبصرے بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً :

علی گڑھ اور چک منگلور کے		
فسادات کا جائزہ	محمد حسن	شمارہ ۳۵-۳۶
جمشید پور کی رپورٹ	"	" ۴۶-۴۷
مشترکہ تہذیبی وراثت کا مسئلہ	"	" ۵۱
آسام میں غیر آسانی قرار دے کر		
مسلمانوں کا بہیمانہ قتل	"	" "
ہندوستانی اقلیتوں کو عدم تحفظ کا احساس	"	" ۵۸
احمد آباد اور . بھیونڈی کے فسادات		
پر ایک رپورٹ	اقتدار عالم خاں	شمارہ ۴
ظلمت و فرقہ پرستی کے خلاف	محمد حسن	" ۵

"عصری ادب" کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اس نے ادب کو جہاں سماجی مسائل کے اظہار کا وسیلہ مانا ہے وہیں ہر لحظ متغیر حالات اور پھر ان کے نتیجے میں نئے نظریات و خیالات سے بھی اس نے آنکھیں نہیں چرائی ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن ترقی پسندی کو محدود معنوں میں نہیں دیکھتے۔ وہ زندگی کی حرکت پذیری کے قائل ہیں اور ہر مادی و فکری تبدیلی کا خندہ پیشانی سے سامنا کرنے کو ترقی پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ازیں سبب "جدیدیت" کو جس طرح دوسرے ترقی پسند نقادوں نے لیا محمد حسن اور عصری ادب کے بعض قلم کاروں نے نہیں لیا۔ عصری ادب نے اس حقیقت کو منکشف کیا کہ جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے ضد نہیں۔ اس نظریے کو استحکام بخشنے والے متعدد مضامین عصری ادب میں شائع ہوئے۔ چند مثالیں پیش ہیں :

کمٹ مینٹ کی نئی بحث	باقر مہدی	شمارہ ۵
بے مقصد ادب کی تلاش	سید محمد عقیل	" ۲۱-۲۲
جدیدیت پسند ادیبوں کے یہاں		
معاشرتی رشتوں کا تصور	عتیق احمد	"شمارہ ۴۸-۴۹
ترقی پسند تحریک کے نئے متبادل	محمد حسن	" ۵۷
اردو تنقید کے جدید رجحانات	ڈاکٹر سید حامد حسن	" ۲۳-۲۴

جدید افسانہ اور اس کے مسائل	ڈاکٹر سید محمد عقیل	”	۲۳-۲۴
جدید غزل نئی علامت نگاری کا ایک حصہ	” ”	”	۸

ترقی پسند ادب پر تنقیدی مضامین اور ہندوستان میں ترقی پسند ادیبوں پر مقالات و مضامین جو ”عصری ادب“ میں شائع ہوئے ان سے اس تحریک کی زندگی کسی قدر احساس پیدا ہوتا رہا۔ چند مثالیں پیش ہیں :

بائیں بازو سے ادیبوں کی وابستگی	محمد حسن	شمارہ	۲۹-۳۰
اردو ناول اور ترقی پسند فکر کی روایت	قمر رئیس	”	۲۱-۲۲
ترقی پسند تحریک کا پس منظر	ڈاکٹر ایوب مرزا	”	۵۷
جدید اور ترقی پسند ادب کی مشترکہ اقدار	محمد حسن	”	۱۳-۱۶
ترقی پسند تحریک کے نئے تہذیبی متبادل کی ضرورت	”	”	۵۷
دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کے ایک جلسے کا جائزہ	”	”	۱۰
ترقی پسند ادب کے نکتہ چیں	تقی حیدر	”	۲۱-۲۲
ترقی پسند نظم	میر عارفی	”	۲۱-۲۲
ترقی پسند تنقید کا کارنامہ اور کمزوریاں	محمد حسن	”	۲۳-۲۴
ترقی پسندوں کا سفر	رضیہ سجاد ظہیر	”	۲۱-۲۲
ترقی پسند غزل	محمد حسن	”	۲۵-۲۶

”عصری ادب“ نے ترقی پسندی کی سُست ہوتی ہوئی رفتار کو از سر نو تیزی عطا کی لیکن اس طرح کہ اسلوب اور موضوعات میں یکسانیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسالہ ہذا میں شائع ہونے والے مختصر افسانوں میں تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ اس تنوع کی وجہ سے ترقی پسندی سے وابستہ بقیہ قلمکار اور نئے ادیب قاری کو اپنے قریب لانے میں کامیاب ہوئے ورنہ یکسانیت نے تو اس تحریک کو بے حد نقصان پہنچایا۔ عصری ادب نے جن نئے فن کاروں کو جگہ دی ان کو بھی اس تنوع سے نئی راہ ملی اور ان کے نزدیک ترقی پسندی کا اعتبار بحال ہوا۔ ذیل کے افسانے اس تنوع کی مثال ہیں :

دو بھیگے ہوئے لوگ	اقبال مجید	شمارہ	۴

دروازہ بند ہے	آغا سہیل	" ۵۲
چھوٹی سی بات	آمنہ ابوالحسن	" ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲۔
بند راستے	ابن کنول	" ۲۹۔۳۰
نیلا پتھر	احمد ندیم قاسمی	" ۳۱۔۳۴
کچنار	اختر اورینوی	" ۳
جوگ کی رات	جمیلہ ہاشمی	" ۳۱۔۳۴
ایک بڑا آدمی ایک غریب یگ	رتن سنگھ	" ۲
دیوانہ مرگیا	رضیہ سجاد ظہیر	" ۲۵۔۲۷
چپ فضا تیز خوشبو	رشید امجد	" ۵۴
سب سے چھوٹا غم	عابد سہیل	" ۲۳۔۲۴
پتھر کا دل	عصمت چغتائی	" ۱۹۔۲۰
پرچھائیاں	قاضی عبدالستار	" ۱
اپنا اپنا ایمان	کرتار سنگھ دگل	" ۲۵۔۲۶
لذت سنگ	کوثر چاندپوری	" ۳
کاغذ کا رشتہ	کرشن چند	" ۴
بل	راجندر سنگھ بیدی	" "

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادباء و شعراء کی سوانح حیات اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف و تعارف بھی "عصری ادب" کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ بات تحریک کی کشش میں اضافہ کرتی ہے اور اسے آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ترقی پسندوں کے علاوہ دیگر قلمکار بھی شامل ہیں لیکن وہ بھی کسی نہ کسی طرح نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند واقع ہوئے ہیں :

اقبال مجید کا تعارف	محمد حسن	شمارہ ۷
عصمت کا فن اور شخصیت	نکہت ریحانہ خان	" ۴۱۔۴۲
شہاب جعفری کا تعارف	محمد حسن	" "
حسرت موہانی۔ رومانی ذہن کی سیاسی شخصیت	علی احمد فاطمی	" ۴۶۔۴۷

پروفیسر عقیل رضوی	رفیع اللہ انصاری	"	۴
جان نثار اختر شخصیت اور فن	ظ۔ انصاری	"	۱۷-۱۸
حبیب جالب پاکستان کا نڈر	محمد حسن	"	۵۴
انقلابی شاعر			
جذبی کی شاعری	"	"	۵۰
جوش ملیح آبادی چند یادیں	جگن ناتھ آزاد	"	۵۰
خالد سہیل کی فکر اپنی تخلیقات			
کی روشنی میں	خالد سہیل	"	۵۸
ساحر لدھیانوی	محمد حسن	"	۴۳-۴۵
عشرت آفریں کی شاعری	علی سردار جعفری	"	۵۵
فراق شخصیت اور کارنامہ	محمد حسن	"	۴۸-۴۹
فیض کی شاعری کا جائزہ	اشفاق حسین	"	۵۱
مجاز جو ایک حقیقت تھا	نصیر حیدر	"	۱
مجروح۔ سنجیدہ غزل گو	محمد حسن	"	۴۶-۴۷
کارل مارکس کی سوانح حیات	"	"	۵۲
لینن کو خراج عقیدت	"	"	۳۵-۳۶

اس کے علاوہ عصری ادب میں اور بھی بہت سے مقالات و مضامین شائع ہوئے جن سے ترقی پسندی کی شناخت قائم رہی۔

مذکورۂ بالا مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ "عصری ادب" نے ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے تحریک کے انحطاطی دور میں اسے عوام میں روشناس کرانے اور صحت مند تبدیلیوں کے ذریعے قلمکاروں میں معتبر کرنے کے لئے جدوجہد کی اور کافی حد تک کامیاب رہا۔ آج بھی یہ سہ ماہی جریدہ ترقی پسند تحریک کی یاد کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

ترقی پسند تحریک اور "عصری آگہی" :

ترقی پسند تحریک کے گم ہوتے خدو خال کو نمایاں کرنے کی "عصری ادب" بساط بھر کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی اس مشن میں ہاتھ بٹانے کے لئے ایک جریدہ "عصری آگہی" جاری کر دیا۔ قمر رئیس چوں کہ خود بھی ایک مقتدر ترقی پسند ادیب و نقاد ہیں لہٰذا انھوں نے اپنے جریدے کے ذریعے ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت پوری دیانت داری کے ساتھ کی۔ "عصری آگہی" میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین' افسانے' منظومات معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند انداز فکر کے کامیاب ترجمان ہیں۔ اس جریدے کی نگارشات نے قارئین کے ایک قابل لحاظ طبقے کو تحریک سے برگشتہ ہونے سے روک لیا اور ترقی پسند قلمکاروں کو اپنی تخلیقی راہ تحریک کے منشور پر استوار کرنے کی ترغیب دی۔ یہ نگارشات ان ملکی وغیر ملکی ادیبوں اور دانشوروں کے زور قلم کا نتیجہ ہیں جو ترقی پسند تحریک کے انتہائی معتبر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں دیکھئے :

مقالات و مضامین

مارکس' اینگلز اور نظریہ جمالیات	جارج لوکاچ	شمارہ مئی ۱۹۷۹ء
ہندوستانی مسلمان اور سیکولرزم	محمد حسن	" "
پریم چند اور فرقہ واریت	قمر رئیس	ج ۱ ش ۴
افغانستان کا انقلاب	اصغر علی انجینئر	جلد ۱ ش ۳
کچھ تخلیق شعر کے بارے میں	ساجدہ زیدی	ج ۱ ش ۱۱
افسانوی ادب اور اس کی تنقید	عابد سہیل	ج ۱ ش ۶
عالم اسلام	اصغر علی انجینئر	" ۷
ادب کا سماجی کردار	خورشید سمیع	" ۱۱
ترقی پسندی سے جدیدیت تک	مظہر امام	" ۴-۵
اکتوبر انقلاب کا اثر اردو ادب پر	کے۔ کے۔ کھر	۲۰ " ۷
ادب' روایت' جدت اور جدیدیت	ممتاز حسین	" ۷
انقلاب ایران پر ایک نظر	ظہیر مسعود قریشی	۱ " ۲
افسانے میں کہانی پن کا عنصر	شہزاد منظر	" ۲ " ۷

''عصری آگہی'' میں ترقی پسند افسانہ نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات پر تجزیاتی مضامین بھی شائع ہوئے جن میں ترقی پسند انداز تنقید اختیار کیا گیا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی ایک تاثر	مجتبیٰ حسین	جلد ۱ شمارہ ۴
سورج کا ایک سفر	ظفر اوگانوی	″ ۲ ″ ۵
سدھ کیا ہوا سانپ		
(الیاس احمد گدی کی کہانی)	تجزیہ عتیق اللہ	″ ۱ ″ ۴-۵
ساتھ جنم کا (رتن سنگھ)	تجزیہ جوگیندر پال- قمر رئیس	
	صادق، عتیق اللہ	″ ″ ″ ″
رضیہ آپا	رفعت سروش	″ ۱ ″ ۹

اس جریدے میں چند ترقی پسند ادیبوں کے سوانح، خود نوشت اور انٹرویو بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان سے ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں اور ان سے وابستہ افراد سے وقفیت حاصل ہوتی ہے نیز ترقی پسند ادب کی معلومات بھی فراہم ہوتی ہے۔

یادوں کی گذرگاہیں	حیات اللہ انصاری	″ ۱ ″ ۲
″	فکر تونسوی سے گفتگو	″ ۱ ″ ۴-۵
″	پرکاش پنڈت سے گفتگو	″ ۱ ″ ۳
ترقی پسند ادب اور میں	عصمت چغتائی	″ ۱ ″ ۱
پشکن کے دیس میں (سفرنامہ)	جگن ناتھ آزاد	″ ۱ ″ ۶

''عصری آگہی'' میں شائع ہونے والے افسانے ایک نئے اسلوب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان میں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ جدید انداز بیان اور نئی تکنیکیں بھی اختیار کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے افسانے بھی شائع ہوئے ہیں جن کو تیسری آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان سے تحریک کو یہ فائدہ ہوا کہ جو ترقی پسند قلمکار نئے اسالیب سے متاثر تھے اور ترقی پسندی کی راہ چھوڑ کر جدیدیت کے خیمے میں چلے جانے والے تھے وہ اپنے ہی یہاں اس اسلوب کی گنجائش دیکھ کر ادھر ادھر جانے سے رک گئے۔ دنیا انھیں جدیدیت پسند کہتی ہے لیکن نظریاتی اعتبار سے وہ قلمکار جنھیں ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں ترقی پسند ہی رہے (باستثناء) :

ہو کا عالم	رتن سنگھ	مئی ۱۹۷۹ء

گمشدہ تاریخ کا ایک باب	عبدالصمد	۱ شمارہ ۱
ایک چوہے کی موت (مسلسل ناول)	بدیع الزماں	" "
تیسری دنیا	جوگیندر پال	" "
میں	جیلانی بانو	" "
ہائی وے پر ایک درخت	اقبال مجید	جون ۱۹۷۹ء
دریچہ	آمنہ ابوالحسن	" "
نوادرات	اقبال مجید	ج ۲ ش ۴
نوادرات	الیاس احمد گدی	" "
کوڑیا پل	پران اکیلا	" "
سونے کی مہر	مرزا حامد بیگ	جلد ۲ شمارہ ۴
ندی	سلام بن رزاق	" ۱ " ۳
وہ آدمی	سہیل عظیم آبادی	" "

"عصری آگہی" نے مشہور ترقی پسند افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی پر ایک خصوصی شمارہ اگست ۱۹۸۲ء میں شائع کیا جس میں بیدی کی حیات، شخصیت اور فن پر مقتدر قلمکاروں کے مضامین، نمائندہ افسانے اور ان پر تجزیے شامل ہیں۔

اس رسالے کا شعری حصہ بھی ترقی پسندی کو نئے اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کا ترجمان ہے۔ اس میں ترقی پسند شعراء اور نمائندہ جدید شعراء کا کلام دوش بدوش شائع ہوتا ہے۔ یہ امر بھی تحریک کے لیے مفید تھا کیوں کہ ترقی پسند قارئیں اور قلمکاروں کو اپنے ذوق کو سنوارنے کا موقع ملا نئے پن کی وجہ سے رسالہ مقبول ہوتا گیا تاکہ وہ تحریک کی خدمت کرسکے۔ اس جریدے کی چند نمائندہ نظمیں اس طرح ہیں :

نئی نسل کے نام	سردار جعفری	" ۲ " ۴
اے شہسوار	"	" "
وداع	شاذ تمکنت	" "
انتشار	ندا فاضلی	" "
مردار	اندر سروپ ناداں	جلد ۲ شمارہ ۴

بے چارے کبوتر	شکیب نیازی	″ ″
ایک نظم	ساجدہ زیدی	″ ۲ ″ ۷
زندگی کی لحد	وامق جونپوری	″ ۱ ۲
خاکی چوکھٹا	عمیق حنفی	″ ″
پس دیوار	کیفی اعظمی	″ ۱ ۳
سربراہ، آئینے اندھے ہیں	ظہیر غازی پوری	″ ″ ۱
آگے اور بھی رستے ہیں	شہریار	″ ۱ ″ ۴
تلاش	ندا فاضی	″ ۱ ″ ۶
فلسطینی شہیدوں کے نام	فیض	″ ″ ۱

غزلیں شاذ تمکنت، گیان چند جین، ابو محمد سحر، آشفتہ چنگیزی، فضا ابن فیضی، لطف الرحمٰن، صدیق مجیبی، محسن زیدی، شہریار، عبداللہ کمال، بانی۔

"عصری آگہی" اپنی اشاعت کے تیسرے سال ۱۹۸۲ء میں بند ہوگیا اور دس سال بند رہنے کے بعد دوبارہ جاری ہوگیا تھا لیکن کچھ مالی و ذاتی پریشانیوں کی بنا پر اس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی اور تین چار شماروں کے بعد تعطل کا شکار ہوگیا۔

پروفیسر قمر رئیس نے گذشتہ چند سال سے ایک نیا سہ ماہی جریدہ "نیا سفر" کے نام سے نکالنا شروع کیا ہے۔ اس کا مقصد بھی ترقی پسند ادب کی خدمت کرنا ہے۔ تاہنوز اس کی اشاعت جاری ہے۔

"آئینہ" اور "فن کار" یہ دونوں رسالے بھی ترقی پسند تحریک کے ترجمان تھے۔ ان کا ذکر انور عظیم نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ ان رسالوں کے چند شمارے ہی نکل سکے جو کوششوں کے باوجود حاصل نہیں ہوسکے ہیں۔ اس لئے ان پر تبصرہ ممکن نہیں ہے۔

(د) ترقی پسند ادب سے انحراف اور اردو میں جدیدیت کا آغاز

۱۔ "تحریک"

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہا گیا ہے کہ آزادی کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک تنزلی کا

شکار ہونے لگتی تھی۔ اسباب بہت سے ہیں لیکن یہاں ان کا ذکر کرنا مقصود نہیں۔ البتہ اتنا بتانا ضروری ہے کہ جب اس تحریک میں بے شمار ایسے لوگ داخل ہونے لگے جن کی فن پر گرفت کمزور تھی اور مطالعہ محدود تھا تو ایسا ادب وجود میں آنے لگا جس میں اکتا دینے والی یکسانیت تھی اور اسی یکسانیت سے تنگ آکر بہت سے شعراء و ادباء جن کی طبیعتیں تجربہ پسند واقع ہوئی تھیں، پہلے اس قسم کے ادب اور بعد میں ترقی پسند تحریک ہی سے منحرف ہو گئے اور اپنا زور قلم ترقی پسند تحریک اور اس کے زیر سایہ تخلیق ہونے والے ادب کی مخالفت میں صرف کرنے لگے۔ اسی دوران کچھ قلم کار جو مغرب کے نئے رجحانات سے متاثر تھے، انھوں نے ان منحرف لوگوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے کے لیے رسالہ "تحریک" کا اجراء کیا۔ اس رسالے کی پالیسی مندرجہ ذیل نکات پر مبنی تھی :

۱۔ کمیونزم کی مخالفت اور جمہوریت کی تبلیغ

۲۔ انفرادی آزادی

۳۔ قدروں کی آفاقیت پر زور

۴۔ کلاسیکی ادب کو رہنما بنانے کی سفارش

۵۔ کلاسیکی فلسفۂ جمالیات کی وکالت

۶۔ موضوع کے بجائے اظہار پر زور

۷۔ نئے ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرانا اور کمیونزم کے خلاف ان کی ذہن سازی کرنا

۸۔ ترقی پسند ادب اور ادیبوں کی تنقیص

۹۔ کمیونسٹ حکومتوں کے عیوب بیان کرنا

اس جریدے نے ادب کے اس قدیم تصور کو فروغ دیا کہ ادب کا کام انسان کے احساس جمال کی تسکین ہے نہ کہ نظریات کی تبلیغ و اشاعت۔ ادب کا مقصدی و افادی کردار محض جزوی ہے کلی نہیں۔ اس سلسلے میں مدیر لکھتا ہے :

> ادب کا مقصد ہے احساس جمال کی تسکین و تربیت۔ یہ مقصد سماجی افادیت سے محروم نہیں۔ اور جو پرچہ اس مقصد کو خوش اسلوبی سے پورا کر سکے وہ اپنے وجود پر ناز کر سکتا ہے۔"

"تحریک" ادب کی افادیت کا قائل ہے لیکن اسے کسی جماعت کا آلۂ کار بنانے کی مخالفت کرتا ہے۔ بقول مدیر :

"ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ملک کی دوسری آبادی کی طرح ادیبوں اور دانشوروں کا بھی فرض بنتا ہے کہ ماحول کو بہتر اور خوش گوار بنانے کی جدوجہد کریں۔ ہرچند کہ ادب کا بنیادی مقصد احساس جمال کی تسکین ہے۔ یہ مقصد بھی سماجی اہمیت و افادیت سے محروم نہیں لیکن ادب اس کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی انجام دے سکے تو اس سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔"

"سماجی ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے ہم بڑی سے بڑی تبدیلی کرنے کو تیار ہیں... اگر ادیب اس معاملے میں بھرپور تعاون کرے گا اور اس موقف کی حمایت کرے گا۔ لیکن کیا معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے یا اس سے آگے بھی چلتا ہے کیا ادیبوں کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ ایک خالص سیاسی پارٹی کو برسر اقتدار آنے میں مدد دیں اور کسی ایک ملک کی سیاست خارجہ کے گرد رقص کریں۔ مثال کے طور پر ترقی پسند ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نرائن کے خلاف اس قسم کی نظمیں لکھیں :

اندھی دولت کا تیر جے پرکاش

اہل زر کا فقیر جے پرکاش

"تحریک" کا ترقی پسند تحریک پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنے دعوے کے برعکس زندگی کے حقائق سے چشم پوشی اختیار کر رہی ہے :

"واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے حقائق سے روگردانی موجودہ ادیبوں نے کی ہے۔ پرانے ادیب اس کے ہرگز مرتکب نہیں۔ پرانے ادیب زیادہ سے زیادہ اپنے تصورات و خیالات کی عینک لگا کر زندگی کا مطالعہ کرتے تھے، لیکن موجودہ ادیبوں نے تو دوسروں کی مہیا کردہ نظریاتی عینک لگا کر زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور دوسروں کے ایماء پر ہر بار اپنی عینک تبدیل کر لی ہے۔"

"تحریک" نے اپنی پالیسی کے مطابق بہت سے نوجوان قلمکاروں کو متعارف کرایا جن میں مخمور سعیدی، شمس صدیقی، کرشن موہن، مہدی عباس حسینی، گورسرن لال ادیب، ماجد

حسن فریدی، طالب دہلوی، رعنا جگی، وشوناتھ درد، صولت ٹونکی، بشیربدر، جاوید وششٹ، عادل منصوری، شہریار، کفیل آزر، شاہد کبیر، ثروت قادری، بشرنواز، قیس رام پوری، فضا ابن فیضی، محمد علوی، پریم وار برٹنی، رئیس رام پوری، کیف، احمد صدیقی، امیر قزلباش قابل ذکر ہیں۔

یہ جریدہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ ان ادیبوں اور شاعروں کے ایک بڑے گروہ نے اپنا موقف تبدیل کرلیا جو ترقی پسند ادبی تحریک کے علمبردار تھے اور انھوں نے اپنا لہجہ بدل کر ''تحریک'' کے صفحات میں جگہ بنالی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے بلندپایہ ترقی پسند شاعر ''تحریک'' کے صفحات میں ترقی پسند نظریہ ادب کی مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شروع شروع میں اس جریدے کے مشتملات روائتی اسالیب کے حامل ہوئے تھے لیکن ۱۹۶۰ء تک آتے آتے منظومات میں جدیدیت کے خدوخال نمایاں ہونا شروع ہوگئے تھے لیکن نثری تخلیقات کا اسلوب روایتی ہی رہا۔ البتہ موضوعات کی سطح پر جدت اور تنوع پیدا ہوگیا۔ بہت سے نئے شعراء چھپنا شروع ہوگئے جن کے لہجے میں تجربے کی مہک اور فکری جدت کی آمد آمد تھی۔ لفظیات بدلنے لگیں اور مضامین میں آفاقیت پیدا ہوگئی۔

''تحریک'' نے بلاشبہ اردو ادب میں جدید رجحان کو پھیلانے میں اور ترقی پسندی کے اثر کو زائل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ذیل میں اس قسم کے کچھ مضامین کی فہرست ملاحظہ کریں :

ترقی پسندی کی مخالفت

ترقی پسندوں کی کانفرنس	گوپال مِتّل	اپریل ۱۹۵۳ء
ترقی پسند اور تحریک	ادارہ	,, ,,
اردو ادب میں جمود کا مسئلہ	گوپال مِتّل	جنوری ۱۹۵۵ء
ادب اور سیاست	سہیل واسطی	دسمبر ۱۹۵۴ء
دو ترقی پسند شاعر	اثر لکھنوی	نومبر ۱۹۵۴ء
اردو ادب کو داخلی خطرے	گوپی ناتھ امن	جولائی ۱۹۵۳ء
سرکاری سرپرستی میں کمیونزم کا پرچار	گوپال مِتّل	فروری مارچ ۱۹۵۴ء
مذہب اور کمیونزم	کرشن موہن	,, ,,

فنکار اور عوام	شفیق انجم سہسوانی	مئی	۱۹۵۴ء
جوش ملیح آبادی کا تنقید سے فرار	محمد عزیز	"	"
فن پر اشتراکی جبر	ابن فرید	اکتوبر	۱۹۵۴ء
تخلیق و تنقید میں اشتراکی نوعیت	پروین فاطمہ	ستمبر	۱۹۶۶ء

جدید رجحانات کی حمایت میں

احیائے ادب کی تحریک	گوپال متل	نومبر	۱۹۵۳ء
پرانی نسل کے خلاف رد عمل	انتظار حسین	"	"
غیر جانبدار ادب	گوپال متل	اکتوبر	۱۹۹۴ء
ادب کا نیا موڑ	"	"	"
ادیب کے لئے آزادی کی اہمیت	"	"	"
ہندوستانی ادیب کے فرائض اور اس کی آزادی	"	اپریل	۱۹۵۵ء
شعر میں لفظ و اسلوب کی اہمیت :	رشید حسن خاں	نومبر	۱۹۵۵ء

اردو ادب کی دنیا میں تقریباً تین عشروں تک اپنی پہچان قائم رکھنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں یہ جریدہ دم توڑ گیا۔

۲۔ "تلاش"

اس جریدے نے جدیدیت کے فروغ کی کوششوں میں تھوڑا بہت حصہ ضرور لیا ہے۔ اس کے خاص نمبر میں شامل تنقیدی مضامین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ رسالہ جدیدیت کا حامی ہے۔ ان مضامین میں ادب کی جمالیاتی قدروں کی تبلیغ کا رجحان ملتا ہے۔ مثلاً راہی معصوم رضا نے اپنے مضمون "نیا ادب اور پرانی کسوٹی" میں نئے ادب کو پرانے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں جانچنے پرکھنے کی مخالفت کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ جدید ادب پر تنقید کرتے وقت موجودہ شعری مزاج کو سمجھنا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں :

"نئی تنقید کو اس تنہائی اور سناٹے کی بنیاد پر اپنے اصول بنانے ہوں گے۔ پہلے اسے تنہائی اور سناٹے کا مزاج داں ہونا پڑیگا اور تب وہ آج کے ادب سے

جمالیاتی انبساط حاصل کرسکے گی اور تب اسے مایوسی سے گردن نہیں ہلانی پڑے گی۔"

درج ذیل مشملات سے اس جریدے کے مزاج اور جدیدیت کے فروغ میں اس کے رول کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تنقید

نیا ادب اور پرانی کسوٹی	راہی معصوم رضا	خاص نمبر
یونگ اور موجودہ پاکستانی ادب	عزیز الحق	"
لسانی حرمتیں اور مقدمات	افتخار جالب	"

افسانے

کچن مائی	دیویندر ستیار تھی
اور بھی غم	ذکی انور
یہ کس کی تصویر ہے	اقبال متین
رشوت	محمد عمر میمن
پوسٹر	سریندر پرکاش
تہ درتہ	بلراج مین را
میں چپ ہوں	گوربچن سنگھ
میمنے کی چھلانگ	برج موہن
دو وجود ایک سایہ	غلام رسول سنتوش

غزلیں

سجاد باقر رضوی، ساحر ہوشیار پوری، حسن نعیم، شہاب جعفری، من موہن تلخ، فضیل جعفری، بشر نواز، بشر بدر، شہریار، عرش صہبائی، عادل منصوری، صلاح الدین نیر، احمد رئیس وغیرہ

نظمیں

معیار	احمد ندیم قاسمی
زندگی نامہ	وحید اختر
کتبے	مخمور سعیدی
ایک آواز ایک تعاقب	حرمت الاکرام
نئے موسم	راج نرائن راز
دو کھڑکیاں	ندا فاضلی
اسٹیشن پر نیند کی گولیاں	محمد علوی

چند برسوں تک جاری رہنے کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

۳۔ "تخلیق"

اس رسالے کا مزاج بھی جدیدیت پسندانہ ہے۔ اس کا "نئی تخلیق نمبر" کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ "تخلیق" کے جو شمارے دستیاب ہو سکے ان کے مطابق تخلیق میں نثری تخلیقات متوازن طرز اختیار کیے ہوئے اور منظومات میں عام طور پر جدیدی رجحان کی نمائندگی ملتی ہے۔

جدیدیت کے علمبرداروں کا دعویٰ تھا کہ وہ عالمی قدروں کی بازیافت اور بین الاقوامی انسانی برادری کے تصور کو فروغ دے رہے ہیں۔ سو اس جریدے میں کہیں کہیں اس کی صداقت کا ثبوت مل جاتا ہے۔

جدیدیت کے موضوعات طے شدہ نہیں لیکن فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی کا اثر اس رجحان کا نمایاں عنصر ہے۔ کرداروں کے لاشعور کا انکشاف جدید افسانے کا ایک خاص وصف رہا ہے۔ "تخلیق" کے صفحات پر ایسے افسانوں کا سراغ مشکل ہی سے ملتا ہے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا مضمون "پریم چند کا ایک افسانوی کردار" میں پریم چند کے افسانے "بازیافت" کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ شکیل الرحمٰن اس افسانے کے ایک نسوانی کردار کا نفسی تجزیہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ پریم چند نے اس زمانے میں اپنے کردار

کے لاشعور کی تہوں کو کھولنے کے لئے شعور کی رو کا استعمال کیا تھا جب اردو میں اس تکنیک کا کوئی وجود نہیں تھا۔ شکیل الرحمٰن کے اس تنقیدی مضمون سے قلمکاروں کو ضرور تحریک ملی ہوگی کہ وہ بھی اپنی تخلیقات میں اس اسلوب اور تکنیک کا استعمال کریں۔

"تخلیق میں شائع ہونے والی منتخب نگارشات اس طرح ہیں۔

نظمیں

رشتہ دل	بلراج کومل	شمارہ ۱
نامکمل شاہ کار	شہاب جعفری	" ۱
انتظار	عتیق تابش	"
انعام	احمد وصی	"
دیدنی ہے شکستگی	کمار پاشی	"
رقص	بانی	"
نیند کا شہر	محمد علوی	دوسرا شمارہ
رات کتنی لمبی ہے	اویس احمد	"
ایک پھول	عادل منصوری	"

افسانے

رشتہ دل	بلراج مین را	شمارہ ۱
قفس اداس ہے	ٹھاکر پونچھی	" ۲

یہ جریدہ بھی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور چند شماروں کے بعد بند ہوگیا۔

۴۔ "سطور"

کمار پاشی کی ادارت میں شائع ہونے والے اس جریدے کا مزاج سرتاسر جدیدیت پسند ہے۔ منظومات میں تنہائی' بے چہرگی' اور خوف و تشکیک کے مضامین نئے استعاروں اور شعور کی رو کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں۔ تنقیدی مضامین بہت کم شائع ہوئے ہیں لیکن ان سے

جدیدیت پسند ادب کے اصولوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

البرٹ کامیو کی وجودیت سے متاثر ہو کر لکھنے والوں کی تعداد اس جریدے میں خاصی بڑی ہے۔ مثلاً سریندر پرکاش، شرون کمار ورما، ساجد رشید، مہدی ٹونکی، شموئیل احمد، قمر احسن، جوگیندر پال، رشید امجد، حمید سہروردی، غیاث احمد گدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، کرشن موہن، بشیر بدر، ندا فاضلی، عادل منصوری، بانی مظہر امام، ناصر شہزاد، ظفر غوری، مخمور سعیدی، محمد علوی، من موہن تلخ، حسن نعیم، راج نرائن راز، حرمت الاکرام، گوپال متل، پرکاش فکری، کرشن مراری، شاہد کلیم، اندر سروپ دت ناداں وغیرہ۔

اس جریدے نے بہت جلد قلمکاروں کو اپنی طرف راغب کیا۔ نئے لکھنے والوں کے لیے بھی یہ جریدہ کافی کشش کا حامل تھا۔ نوجوان نسل کو پہیلیوں میں بات کرنے کا انداز بہت بھایا اور کیفیتوں کے اظہار کے لیے نئے استعاروں کی تلاش میں عجیب لذت حاصل ہونے لگی۔ لہٰذا ان کے ذوق کی تسکین اس جریدے کے ذریعے ہونے لگی۔

اس طرح جدیدیت کو فروغ دینے میں یہ رسالہ بہت معاون ثابت ہوا۔ ذیل میں اس کی کچھ منتخب تخلیقات و مضامین کی فہرست درج ہے۔

افسانوی ادب :

آرٹ گیلری	سریندر پرکاش	جلد ۱ شمارہ ۱
کوئی دروازہ نہیں	شرون کمار ورما	" "
تین بائی چار	ساجد رشید	" "
ٹوٹی دشاؤں کا آدمی	شموئیل احمد	"۱ " ۴
لاحاصل سفر	شرون کمار ورما	" ۳
گرداب اور پہیلیا	قمر احسن	ج ۲ر ۷۷ ۱۹ء
بن باسی	مہدی ٹونکی	ج ۳ر ستمبر "
پرندہ پکڑنے والی گاڑی	غیاث احمد گدی	خاص نمبر جلد ۴
مردہ گھر	دیویندر اسّر	"
کمپوزیشن پانچ	بلراج مین را	"

برف پر مکالمہ	سریندر پرکاش	”
رسائی	جوگیندر پال	”
لکڑی کا آدمی	اقبال متین	”
آخری آدمی	رتن سنگھ	”
صد سطری قلم نامہ	کمار پاشی	”
زمین جاگتی ہے	مرزا حامد بیگ	ج ۵
تعاقب	مجید انور	ج ۷
راستے کا پہاڑ	آنند مہر	ج ۸
دیمک	علی امام نقوی	ج ۹
بھوشیہ وانی	خالد حسین	ج ۱۱

سریندر پرکاش کے منتخب افسانے (مشمولہ یک موضوعی شمارہ ۸۱ء)

نظمیں

محمور سعیدی، محمد علوی، زاہدہ زیدی، کمار پاشی، ن۔ م۔ راشد، شاذ تمکنت، باقر مہدی، عمیق حنفی، مظہر امام، کرشن موہن، شہریار، حرمت الاکرام، رام پرکاش راہی، شکیب نیازی، ظہیر غازی پوری، تاج مہجور، شاہد کلیم، چندر بھان خیال، سرشار بلند شہری، ڈاکٹر نریش۔

تیرہ چودہ سال تک جدیدیت کی ترجمانی کرتے رہنے کے بعد یہ جریدہ نامساعد حالات کی بناء پر بند ہو گیا۔ اس پرچے کے ذریعے جدیدیت کو بلاشبہ آگے بڑھنے کا موقع ملا۔

۵۔ ’’محور‘‘

’’محور‘‘ کا زمانہ جدیدیت کے شباب کا دور ہے ’محور‘ نے اس شباب کو نکھارنے اور سجانے سنوارنے میں بھرپور تعاون دیا ہے۔ گو اس کی اشاعت کا زمانہ کم ہے لیکن اپنے مختصر دور اشاعت میں اس جریدے نے کافی نام کمایا اور ادب کے نئے اسالیب کو قارئین میں متعارف کرایا۔ لیکن مبہم تخلیقات کی اشاعت سے پرہیز کیا۔ اور اس طرح صحت مند جدید

ادب کے فروغ میں اس جریدے نے بساط بھر کوشش کی۔ جو قلمکار اس جریدے سے وابستہ رہے ان کے نام اس طرح ہیں :

عادل منصوری، وزیر آغا، بلراج کومل، اختر الایمان، انجم اعظمی، سحر انصاری، کمار پاشی، شور علیگ، منیر نیازی، احمد شکیب، جمیل ملک، عالی جعفری، ناہید ثانی، شفیق ناظم، ناصر شہزاد، نور بجنوری، سیف زلفی، بشیر بدر، شیم حنفی، حنیف کیفی، وزیر آغا، محمود ہاشمی، مجتبیٰ حسین، راج کمل چودھری، پال ولیری، دیوندر کمار، قیوم نظر، عمیق حنفی، ممتاز مفتی، حمید الماس وغیرہ۔

۶۔ "ذہن جدید"

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کا مقصد ہی جدید ادب کو فروغ دینا ہے۔ لیکن یہاں بھی جدید سے مراد وہی نیاپن ہے جس میں اسلوب کی سطح پر تجربہ پسندی کا رجحان نمایاں ہے، موضوعات متنوع ہیں۔ ابہام سے گریز کرکے قاری سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"ذہن جدید" کی اشاعت جاری ہے اور اپنے مشتملات کے توسط سے یہ جریدہ صحت مند ادبی اقدار کو فروغ دینے کی خدمت بطریق احسن انجام دے رہا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں زیادہ تر ۱۹۵۰ء کی نسل کے لوگ ہیں جو بعد میں افق ادب پر نمودار ہوئے اور جنھوں نے جدیدیت کے رجحان کی بڑھ چڑھ کر نمائندگی کی ہے۔ آج بھی ان لوگوں نے جدیدیت کے فاسد مادے کو ترک کرکے اس کی آبیاری کو جاری رکھا ہے اور عالمی ادب سے اردو ادب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

(ہ) جدید تر یا تیسری آواز کا ادب اور "معیار"۔ "تناظر"۔ "شعور"

بعض جرائد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ترقی پسند و جدیدیت سے مختلف اور دونوں کی صحت مند قدروں کے امتزاج پر مبنی ادب کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جدیدیت کا زمانہ عام طور پر ۸۵ء تک مانا جاتا ہے اور اس کے بعد کے ادب کو مختلف نام دیئے گئے ہیں مثلاً جدید تر، مابعد جدیدیت، اور تیسری آواز کا ادب۔ حالانکہ جدیدیت کے امام شمس الرحمٰن

فاروقی اس بات کی پر زور تردید کرتے ہیں کہ جدیدیت ختم ہوگئی ان کے مطابق یہ آج بھی جاری ہے۔اس سلسلے میں ان کا استدلال ہے کہ :

''موجودہ ادب جن تصورات سے عبارت ہے وہ سب جدیدیت ہی کے لائے ہوئے ہیں اور جدیدیت ہی کے قائم کردہ ہیں۔ مثلاً آج کون ہے جو ادیب کی آزادی اظہار کا منکر ہو؟ آج کون ہے جو ادب میں ابہام 'اشاریت 'علامت اور علامت کی پیدا کردہ دبازت اور گنجان پن کا قائل نہ ہو؟ آج کون ہے جو ادیب کو کسی مخصوص سیاسی مسلک کا پابند بنانا ضروری سمجھتا ہے؟ آج کون ہے جو ادب کو جانچنے کے لیے غیرادبی معیاروں کو بروئے کار لانا بہتر سمجھتا ہو؟

ظاہر ہے ایسا کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ آج بھی ادب کے بارے میں جو نظریہ ہماری تخلیقات میں جاری و ساری ہے وہ جدیدیت ہی پر مبنی ہے۔ ایسی صورت میں بدلے ہوئے تناظر کی بات کرنا محض غلط فہمی پھیلانا ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی : ''جدیدیت آج کے تناظر میں'' شب خون الہ آباد اگست ۹۴ء ص۔۴)

شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ قول کافی حد تک صحیح نظر آتا ہے۔ کیونکہ موجودہ ادبی تناظر میں ایسا کوئی نیا ادبی نظریہ یا اصول دکھائی نہیں دیتا جس کو جدیدیت سے علیحدہ قرار دیا جائے۔ رہا سوال ساختیات پس ساختیات اور رد تعمیر کا تو وہ ادب کی قرأت کا ایک طریقہ ہے تخلیقِ ادب کا نہیں۔ البتہ کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے صالح عناصر پر مبنی ادب کو فروغ دے رہے ہیں تو ایسی صورت میں بھی جدیدیت تو بہرحال زندہ رہی اور ساتھ ہی بقول ان حضرات کے ترقی پسندی بھی (سیاسی مسلک کی پابندی کے بغیر)۔ اس کے باوجود ہم ذیل کے رسائل کا جدیدتر یا تیسری آواز کے رجحان کے تحت تذکرہ کریں گے کیوں کہ ان کے مدیران و مرتبین ان کو اسی خانے میں رکھنا چاہتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے اداریوں میں کیا ہے۔

۱۔ ''معیار''

اس رسالے کے صرف تین شمارے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ جن کے مطالع سے

پتہ چلتا ہے کہ اس کی تخلیقات میں احتجاج کا عنصر حاوی ہے۔ ان تخلیقات میں اپنے سماج اور ماحول کا شعور بھی ہے اور بین الاقوامی حالات کی اثر پذیری بھی۔ جدیدیت انفرادتیت پسندی اور داخلیت پسندی کا رجحان بہت کم ہے۔ زبان اور اسلوب کی سطح پر بھی نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس جریدے نے نوجوان قلمکاروں کو بے حد متاثر کیا۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس ادب کے افق پر نمودار ہونے والے فنکار جن میں اکثریت ان کی تھی جو جدیدیت کی ابہام پسندی اور وجودیت پسندی سے نکل کر نئی وسعتوں کی تلاش میں تھے اور انہوں نے اس نئے اسلوب کو خوش آمدید کہا اور ادب کی ان نئی قدروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جو مختلف جدید و قدیم نظریات کے امتزاج سے وجود میں آئی تھیں۔ اس نئے رجحان نے نثری شاعری کو بھی نیا موڑ دیا۔ پہلے شمارے کے مرتبین میں چوں کہ بلراج مین را بھی شامل تھے لہٰذا اس میں اشتراکی مواد کو نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ لیکن بعد کے شمارے کسی خاص سیاسی مسلک کے موئد نظر نہیں آئے۔

مندرجہ ذیل ہندوستانی و پاکستانی قلمکاروں کی نگارشات نے "معیار" میں شائع ہو کر تیسری آواز کے رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا :

افتخار جالب، خالدہ اصغر، محمد سلیم الرحمٰن، مجید امجد، منیر نیازی، اعجاز احمد، ساقی فاروقی، ثروت حسین، جیلانی کامران، انیس ناگی، زاہد ڈار، کشور ناہید، سرمد صہبائی، سہیل احمد، عبدالرشید، صلاح الدین محمود، ذوالفقار احمد تابش، مسعود منور، انتظار حسین، باقر مہدی، زبیر رضوی، عادل منصوری، ندا فاضلی، عین رشید، مشتاق علی شاہد، محمود ہاشمی، اقبال اختر، انتونیو گرامچی، انور عظیم، شمیم حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذ تمکنت، مخمور سعیدی، نشتر خانقاہی، شہریار، زیب غوری، پرکاش فکری، حرمت الاکرام، حسن نعیم، محمد علوی، بشیر بدر، شاہد ماہلی، بانی، ممتاز راشد، سلطان اختر، صادق، فضا ابن فیضی، شفق، غلام مرتضیٰ راہی، مصور سبزواری، حامدی کاشمیری، حکیم منظور، لطیف الرحمٰن، فاروق، عقیل شاداب، پریم کمار نظر، رونق نعیم، مظفر ایرج فیض وغیرہ۔ ان میں سے بیشتر قلمکار آج بھی جدیدیت کے نمائندہ ترجمان ہیں یعنی تیسری آواز اگر جدیدیت سے الگ چیز ہے تو اس کی مثال اس صنعت کار کی نئی صنعت کی سی ہے جسے انکم ٹیکس کے بچت کی خاطر اس نے اپنے کسی قریبی عزیز کے نام سے رجسٹرڈ کرا لیا ہو۔ تاکہ اس کو علیحدہ مرتبہ حاصل ہو جائے۔ مطلب یہ کہ جدیدیت سے

بدکنے والوں کو فریب دینے کے لیے یہ نام تراش لیا گیا ورنہ آپ ہی بتایئے وہی قلمکار جو جدیدیت کے پر جوش حامی آج بھی ہیں دوسرے رجحان کی نمائندگی کسی مخصوص رسالے میں کس طرح کرسکتے ہیں۔

۲۔ شعور

جس دور میں "شعور" جاری ہوا تھا وہ دور ابہام پسند جدیدیت کے بکھراؤ کا دور تھا۔ دستیاب شماروں کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس جریدے کے ترتیب کار بلراج مین را کے نزدیک اس کے اجراء کا مقصد مارکسی سوشلزم کی اشاعت تھا۔ فرق صرف اسلوب کا ہے۔ جدیدیت کا اثر چوں کہ اذہان پر باقی تھا للذا "شعور" کے مشتملات میں انداز بیان اور لفظیات تو جدیدیت کی استعمال کی گئیں لیکن موضوع کی سطح پر طبقاتی کشمکش' بادشاہوں' جاگیرداروں اور دوسرے سرمایہ داروں کے ذریعے کمزور طبقوں کا استحصال' ضمیروں کی خرید و فروخت کے قصوں کی گونج اس کی تخلیقات میں سنائی دیتی ہے۔ یوں بھی جدیدیت کی شناخت چند گنے چنے موضوعات سے نہیں بلکہ اسلوب بیان ہی سے ہوتی ہے۔ آبادیوں کے تیزی کے ساتھ صنعتیائے اور شہریائے جانے (INDUSTRIALIZATION AND URBUNIZATION) کے عمل نے انسانی قدروں کو جس شکست و ریخت سے دوچار کیا' اس کے نتیجے میں سماجی رشتوں میں جو جذباتی خلا پیدا ہوا اور نتیجہ ان کے اندر جو زبردست احساس تنہائی پیدا ہوا تھا وہ بلا شبہ جدید ادب کے موضوعات میں غالب عنصر کا درجہ رکھتا ہے لیکن جدیدیت کے اپنے کوی طے شدہ موضوعات ہرگز نہیں تھے۔ داخلیت کے اظہار کو ترجیح دینے کا رجحان محض ایک فیشن تھا ورنہ جدید ادب کے علمبرداروں نے ہمیشہ تعینِ موضوعات کی مخالفت کی اور دیگر امور کی طرح موضوعات کی سطح پر بھی فرد کی آزادی کی سفارش کی۔ اس میں شک نہیں کہ قادر الکلام جدید شعراء نے بظاہر حقیر سے حقیر نظر آنے والے موضوعات پر دلچسپ اور کامیاب فن پارے تخلیق کیے۔ جدیدیت کو عام طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا ردعمل قرار دیا جاتا ہے اور یہ کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ اسی لئے جدید شعراء و ادباء نے انتخاب موضوع کی آزادی کے باوصف ترقی پسند نظریات کو چھوا تک نہیں۔ انفرادیت وجودیت پسندی اور تنہائی کے موضوعات ایک فیشن کی طرح اس پر طاری ہوگئے اور لوگوں نے انہی چند موضوعات کو

جدیدیت کی پہچان سمجھ لیا۔ یہ صحیح ہے کہ جدیدیت موضوع کے بجائے پیرائیہ اظہار کو مقدم مانتی ہے۔ تو پھر اس کی پہچان طرز ادا ٹھہری نہ کہ موضوع۔ اس اعتبار سے کسی فن پارے کا موضوع خواہ تنہائی ہو یا سماجی زندگی' ذات کا کرب ہو یا بورژوا طبقے کے مظالم' انفرادی وجودیت ہو یا اجتماعیت' اشتراکی حقیقت نگاری ہو یا عریاں حقیقت نگاری' اگر اسلوب بیان جدید اور فنکارانہ ہے یعنی علامتی' استعاراتی اور تجریدی پیرائیہ میں بات کہی گئی ہے تو وہ فن پارہ جدید ادب کے دائرے میں آئے گا۔ ''شعور'' کا امتیازی وصف یہی ہے کہ اس میں شامل تخلیقی و تنقیدی نگارش چند مخصوص موضوعات' جنہیں غلطی سے جدیدیت کا معیار سمجھ لیا گیا تھا' کی پابند نہ ہو کر طرز اظہار کی جدت کا پتہ دیتی ہیں اور ان میں ترقی پسند موضوعات کے تئیں معاندانہ رویہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ سریندر پرکاش کا افسانہ ''بجوکا'' سلام بن رزاق کا ''بازگوئی'' یا انور سجاد' احمد ہمیش اور انور عظیم کے افسانے اور ناول ہوں' سب کا مرکزی خیال ترقی پسند نظریات پر مبنی ہے۔ لیکن یہ افسانے جدیدیت کے نمائندے بھی ہیں۔ کلکتہ شہر پر لکھی گئی نظمیں' انتونیو گرامچی ژاں پال سارتر کے مضامین اور دیگر ملکی قلمکاروں کی نگارشات بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ذیل میں اس جریدے میں چھپنے والے اہم قلمکاروں کے نام درج کیے جاتے ہیں :

میراجی' ن۔م۔راشد' محمود ہاشمی' اعجاز احمد بشر' منٹو' شمیم حنفی' سریندر پرکاش' انور سجاد' بلراج مین را' سرمد صہبائی' محمد سلیم الرحمٰن' احمد جاوید' احمد مشتاق' اطہر نفیس' اقبال ساجد' امجد اسلام امجد' انور ادیب' پروین شاکر' ثروت حسین' جاوید شاہین' ذوالفقار احمد تابش' ساقی فاروقی' سلیم احمد' سلیم شاہد' شہزاد احمد' صابر ظفر' ظفر اقبال' کشور ناہید' مجید امجد' منیر نیازی' نذیر قیصر' عمیق حنفی' بلراج کومل' باقر مہدی' زبیر رضوی' کمار پاشی' شہریار' احمد ہمیش' عین رشید' نسیم انجم بھٹی' انتظار حسین' غیاث احمد گدی' انور عظیم' حنیف رامے' س۔ح۔منٹو' وارث علوی' عمانوئیل کزکیوج' خالدہ اصغر' ساگر سرحدی' عتیق احمد' بلراج ورما' محمد علوی

۳۔ تناظر

''تناظر'' کے اجراء کا زمانہ جدیدیت کے انتشار کے بعد شروع ہوتا ہے۔ گو اس کے

اجراء کا مقصد جدیدیت کے تحلیل ہوتے نقوش کو از سرنو نمایاں کرنا تھا لیکن اپنے عصری تقاضوں کو پورا کرنا بھی ضروری تھا لہٰذا اس جریدے کے مشمولات متوازن انداز اختیار کئے ہوئے ہیں اور جدیدیت کی نمایاں خصوصیت یعنی ابہام سے گریز بھی امکانی حد تک پایا جاتا ہے۔ اس جریدے نے جدیدیت کی صحت مند خصوصیات کو اختیار کرکے اپنے لیے ایک الگ راہ بنائی تھی جس میں ہمعصر ادبی قدروں کا احترام بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے ادبی مزاج کو ناقدین نے مابعد جدیدیت کا نام دیا ہے۔ اس جریدے کے اغراض و مقاصد اس کے اداریے میں مندرجہ ذیل بیان کئے گئے ہیں :

۱۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا ارتقاء
۲۔ قومی اور بین الاقوامی یکجہتی کی پاسداری
۳۔ صالح عالمی اقدار کی دریافت و بازیافت
۴۔ ادب اور تنقید کی صحیح سمت و رفتار کا تعین
۵۔ جمہوریت، سیکولرزم اور انسان دوستی کا ہمہ جہتی فروغ
۶۔ نئی نسل کی ذہنی و حسی تہذیبی و تشکیل
۷۔ فن کی بنیادی اقدار کی تلاش اور از سرنو ترویج و اشاعت

مدیر کا قول ہے :

"تناظر" کی پالیسی ہے کہ وہ کسی مخصوص طریق زندگی یا نظریے کا پابند نہیں..... میں ادب میں نام نہاد جدیدیت کا اتنا ہی کم قائل ہوں جتنا نام نہاد ترقی پسندی کا..... ادب کو چکرویوہ میں ڈالنے کی بجائے میں اسے ماضی کی اس کڑی سے جوڑنا چاہتا ہوں جس سے ہم سب جڑے ہیں۔" ؎

گویا یہ جرنل جدیدیت اور ترقی پسندی کے بیچ سے ایک راہ نکال کر اس کا سرا ماضی کے ادب سے جوڑنا چاہتا ہے اور یہی مابعد جدیدیت کے رجحان کے عمومی وصف ہے۔ "تناظر" میں بھی تقریباً وہی قلمکار چھپتے رہے ہیں جن کو جدیدیت کا علم بردار کہا جاتا ہے۔ فرق یہ ہو سکتا ہے کہ اس جریدے میں شامل ان کی تخلیقات و مضامین مذکورہ بالا پالیسی کے مطابق ہوں اور ایسا فی الواقع ہے بھی۔ ان قلمکاروں کے نام درج ذیل ہیں :

اندر سروپ دت ناداں، کرشن موہن، مظہر امام، بلراج حیرت، ظفر غوری، اسعد بدایونی،

راج نرائن راز، خورشید الاسلام، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم فاروقی، بانی، مخمور سعیدی، ساحر ہوشیار پوری، شاہد کلیم، رخسانہ جبیں، من موہن تلخ، حکیم منظور، حسن نعیم، زبیر رضوی، مظفر حنفی، نشتر خانقاہی، حامدی کاشمیری، مصور سبزواری، کالیداس گپتا رضا، آزاد گلاٹی، پرکاش فکری، رشید افروز، رام پرکاش راہی، اسلم آزاد، کاوش بدری، پریت پال سنگھ بیتاب، مصحفی اقبال توصیفی، ظہیر غازی پوری، کرشن مراری، طارق جامی، سرور عثمانی، سلیم شہزاد، یعقوب عامر، قاصی سلیم، بمل کرشن اشک، ندا فاضلی، گوپال متل، بلراج کومل، جگن ناتھ آزاد، عمیق حنفی، کمار پاشی، شہریار، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، حمید الماس، آمنہ ابوالحسن، شہپر رسول، گوپی چند نارنگ، تاراچرن رستوگی، شمیم احمد۔

متذکرہ بالا مطالعہ سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد اردو ادب میں جو تحریکیں یا رجحان اٹھے، ان کی ترجمانی کے لیے متعدد جرائد منظر عام پر آئے جنھوں نے ادب کو مختلف جہتوں سے روشناس کیا۔ نئے لکھنے والوں کو ادب کے تازہ نظریات و تصورات فراہم کیے اور ان کی روشنی میں جو ادب تخلیق ہوا اس نے بلاشبہ اردو کے وقار کو بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ترقی پسند ادبی تحریک نے شعر و ادب کو زمینی حقیقتوں کا مزاج آشنا بنا کر اسے نوع انسانی کے اجتماعی شعور و لاشعور کی ترجمانی کی قوت عطا کی۔ نیز ادب اور سماج کے باہمی رشتوں کا سراغ لگایا۔ اس تحریک نے ادب کو امراء کے درباروں سے نکال کر اسے گاؤں کی چوپالوں تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیا اور ان کوششوں میں دلی کے ادبی رسائل برابر تعاون دیتے رہے۔ "شاہراہ" "عصری ادب" "عصری آگہی" "فن کار" اور "آئینہ" جیسے رسالے مقدور بھر ترقی پسند ادب کی اشاعت کے ذریعے اسے فروغ پہنچاتے رہے جن میں ثانی الذکر آج بھی اپنی ذمہ داری نبھا رہا ہے۔

جدیدیت کی اشاعت میں بھی دلی کے رسائل پیش پیش رہے۔ "تحریک" نے جہاں ترقی پسند ادب کی تحریک کو نقصان پہنچایا وہیں اس نے ایسے قلمکاروں کو متعارف کرانے کا بھی فرض ادا کیا جو گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اور جن کا ادبی مسلک غیر جانب داری پر مبنی تھا۔ جو نہ رومانویت پسند تھے اور نہ ترقی پسند بلکہ اپنی کلاسیکی روایات کو سینے سے لگائے اسلاف کی چھوڑی ہوئی قدروں کی آبیاری میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ انحراف سے جدیدیت کی طرف تخلیق کا رخ موڑنے کی ابتدا بھی اس نے کی۔ "تلاش" اور "تخلیق" نے

اس رجحان کو ہوا دی اور "سطور" اور "محور" نے اس ہوا کو آندھی میں تبدیل کیا۔ جب کہ سب سے آخر میں جاری ہونے والا پرچہ "ذہن جدید" فی زمانہ اس اسلوب ادب کی ترجمانی اور اسے عصری حسیتوں سے ہم آہنگ کرنے کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ "شعور" "معیار" اور "تناظر" نے جدید ادب کی نئی جہتوں کی نمائندگی کی اور گذشتہ تحریکوں سے صالح عناصر اخذ کر کے موضوع اور ہیئت سے متعلق تنازعات کو سلجھانے کا کام کیا۔ آج کے زمانے میں یہی اسلوب پسندیدہ ہے اور دہلی کے موجودہ جرائد مثلاً "آجکل" "کتاب نما" "ایوان اردو" "عصری ادب" اور "ذہن جدید" وغیرہ اسی ادبی روش کی نمائندگی کا حق ادا کر رہے ہیں۔

باب سوئم

دہلی کے ادبی رسائل کے اداریے

اداریہ کیا ہے ؟

اداریے کی کوئی جامع تعریف بیان کرنا ایک مشکل کام ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اخبار یا رسالے کی پالیسی کے مطابق قارئین کی رائے کو ہموار کرنے اور عصری حالات و واقعات کا اس پالیسی کی روشنی میں جائزہ لینے کے بعد عوام کو اس سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جو مختصر مضمون اخبار یا رسالے کا مدیر تحریر کرتا ہے' اسے اداریہ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اداریہ کی مکمل تعریف نہیں ہوئی بلکہ اس کی وہ خصوصیت بیان کی گئی جو ظاہر میں دکھائی دیتی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ مختلف ماہرین صحافت نے اداریے کی کیا تعریفیں متعین کی ہیں :

ایف فریر بانڈ :

"اداریہ ایک ایسا مضمون ہے جو ہنگامیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس ہنگامی مضمون کا مقصد اخبار کی رائے کا اظہار ہے۔"

کارل.جی ملر :

"اداریہ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہو۔ اور جس میں قاری کی سوچ ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کی رائے میں صحیح راہ ہو۔ اداریہ نویس قاری کو ایسے نقطہ نظر سے متعلق۔ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جس سے قاری قائل ہوجائے اور موافق رد عمل ظاہر کرے۔ اداریہ نویس مختلف ترغیبی طریقوں سے کام لے کر قاری کے جذبات واحساسات کو جائز طور پر متاثر کرتا ہے۔"

میکس مولر :

"اداریہ ان رجحانات پر تبصرے کا نام ہے جو روزمرہ واقعات کی تہہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔"

عبد القیوم :

"اخبار کے ادارتی کالم اخبار کے عوامی مسائل اس وقت کی رائے عامہ منعکس کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ بڑے سے بڑا متشکک انسان بھی یہ تسلیم کرے گا یہ طریقہ جمہوری اصولوں کو قوت بخشتا ہے۔"

فرینک کوب :

"اداریہ نہ تو لچھے دار تقریر ہے نہ ادبی مضمون۔ یہ مطالعہ، رپورٹنگ، تجزیے اور تحریر سے عبارت ہے۔ اداریہ اس ناگزیر سوال کا جواب ہے مجھے کیا؟ اداریہ اس اظہار کا باعث بننا چاہیے کہ بات ہوئی نا ! کیسا نکتہ پیدا کیا، ٹھیک ہے۔"

ڈاکٹر ایم لائل اسپنر :

"اداریہ رائے کو متاثر کرنے یا قاری کو محفوظ کرنے کے لئے حقائق اور نکتہ نظر کو مختصر، منطقی اور خوش گوار انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔ یا اسے خبروں کی ایسی توجیہہ قرار دیا جاسکتا ہے جس سے عام قاری کسی خاص خبر کو واضح طور پر سمجھ سکے۔"

ولیم ایلن وائٹ :

"اداریہ وقت کے رجحانات یا خبروں پر ایسا آزادانہ اظہار خیال ہونا چاہئے جسے ایک ہمدرد اور عقل مند شخص نے جرأت کے ساتھ مختصر طور پر قلم بند کیا ہو۔ اداریے میں درشتی، تعصب اور خوف کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہ چیز خواہ کتنی ہی بے خوفی کی مظہر ہو اصل میں کمزوری کی علامت ہے۔"

مسکین علی حجازی :

"اداریہ نویس کی طرف سے کسی ہنگامی موضوع پر مباحثے میں تحریری طور پر حصہ لینے کا نام اداریہ ہے۔"

راحت سہیل :

"ہنگامیت کا مظہر وہ صحافتی مقالہ جو اخبار یا رسالے کی پالیسی کے مطابق قارئین

کی رہنمائی ان کے حقوق کی حفاظت میں مسائل کی حفاظت کے لیے لکھا جاتا ہے۔"

("اردو اداریے کا ارتقا" راحت سہیل مطبوعہ لاہور ۱۹۹۷ء ص ۱۴ تا۱۶)

ظاہر ہے یہ تمام تعریفیں اخبارات کے اداریوں کی سامنے رکھ کر متعین کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسائل کے اداریوں پر کتاب تو کیا کوئی قابل ذکر مضمون بھی کم از کم اردو زبان میں شائع نہیں ہوا ہے۔ اور اگر ہوا ہے تو ہماری نظر سے اب تک نہیں گزرا۔ بہرحال۔ ادبی رسائل کے اداریوں کا مزاج بھی متذکرہ بالا تعریفوں میں بتائی گئی خصوصیات میں سے بیشتر کا حامل ہوتا ہے۔ البتہ ادبی اداریوں میں نہ تو اختصار کی قید ممکن ہے اور نہ اس بات کی کہ اس کا موضوع روزمرہ واقعات پر مبنی ہو کیوں کہ ادبی اداریہ ادبی صورت حال کا تجزیہ پیش کرتے وقت تاریخی ارتقاء پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ رہا سوال یہ کہ اداریہ ادبی مضمون نہیں ہے جیسا کہ فرینک کوب کا خیال ہے تو یہ بات بھی اخبارات اور نیوز میگزین کی حد تک صحیح ہے۔ رہی بات ادبی رسائل کی تو ان کے لئے یہ مثبت اور ترجیحی صفت ہے۔

ادبی رسائل کے اداریے

اردو میں اداریے کی ابتدا اخبارات سے ہوتی ہے۔ دہلی اردو اخبار اور اودھ پنچ کے اداریے خاصے کی چیز ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ اداریے کی تعریف کے ذیل میں کہا گیا ہے۔ اخبارات کا اداریہ کسی ہنگامی موضوع پر اداریہ نویس کی ذاتی رائے کا ترجمان اور اخبار کی پالیسی کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کا مقصد قارئین کو اخبار کی پالیسی کا ہمنوا بنانا ہوتا ہے۔ لہٰذا دیگر زبانوں کے اخبارات کی طرح اردو اخبارات میں بھی ہر طرح کے سیاسی و سماجی موضوعات پر بہترین اداریے لکھے گئے۔ لیکن ادبی اداریوں کی گنجائش ان میں نہ کے برابر تھی۔ رسائل کی اشاعت کے آغاز نے اس کمی کو پورا کردیا۔ بعض سرکاری رسائل کو چھوڑ کر جن کے اداریے اکثر حکومت کے ترقیاتی پروگراموں کی تشہیر کی حیثیت رکھتے ہیں، باقی تمام ادبی رسائل اپنے اداریوں کے ذریعے مدیر کے ادبی رجحان یا کسی ادبی مسئلے پر اس کی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان اداریوں میں عصری ادبی مباحث پر قابل ذکر مواد موجود ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر موجودہ باب میں ہم دہلی کے اہم ادبی رسائل جو آزادی کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ ان کے اداریوں کا مطالعہ کریں گے۔ جن میں کوئی ادبی نکتہ اٹھایا گیا ہے یا

ادبی دنیا میں رونما ہونے والے کسی واقع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یا ادبی رجحانات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جن رسائل میں ادبی اداریہ نویسی کی روایت نہیں رہی ہے ان کا ذکر اس باب میں نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً "آج کل" اور "بیسویں صدی" وغیرہ۔ "آج کل" میں اداریے کے طور پر "ملاحظات" کا کالم ہوتا ہے۔ جس میں ملک کے ترقیاتی منصوبوں اور سرگرمیوں کی رپورٹیں اور مشاہیر کی وفیات کی خبریں۔ شائع ہوئی ہیں۔ "بیسویں صدی" میں اداریے کا کالم سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ البتہ ایک مستقل کالم "تیرونشتر" کے عنوان سے ہوتا ہے جس میں کارٹونوں کی مدد سے سیاسی و سماجی حالات پر طنزیہ فقرے پیش کیے جاتے ہیں۔ "اردو ادب" کے اداریوں میں رسالے کے مشتملات کا ذکر ہوتا ہے۔ اور رسالے کی اشاعت سے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس باب میں ہمارے مطالعے کا موضوع وہی اداریے ہیں جو ادب سے متعلق ہیں۔ ان میں "شاہراہ" "تحریک" "سطور" "معیار" "محور" "تخلیق" "تلاش" "شعور" "تناظر" "عصری ادب" "عصری آگہی" "ذہن جدید" "کتاب نما" اور "ایوان اردو" کو شامل کیا گیا ہے۔

زیر مطالعہ رسائل میں بعض مخصوص رجحانات و تحریکات کے ترجمان ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ترجمان رسائل کے مدیران نے اپنے اداریوں میں ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال پر تبصرہ کیا ہے۔ ادب کی سماجی ذمہ داری کے نظریے کی تشہیر بھی ان کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ یہ رسائل اپنے قلم کاروں کو اس بات کی مسلسل تلقین کرتے ہیں کہ۔۔۔ انسانی سماج اور زندگی کو بہتر بنانے کے لئے نیز سائنٹیفک طرز فکر کو فروغ دینے کے لئے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے قلم کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس تحریک کے ترجمان رسائل کے اداریوں میں اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کی آگہی کا پورا پورا شعور نظر آتا ہے۔ فرقہ پرستی، استحصال اور ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج کی آواز بھی ان اداریوں میں بلند کی گئی ہے۔

جدیدیت کی ترجمانی کرنے والے رسائل دو طرح کا مزاج رکھتے ہیں۔ پہلی قسم شدت پسندی کو فروغ دینے والوں کی اور دوسری قسم ان رسائل کی ہے جنھوں نے اعتدال پسندی کی روش اختیار کی ہے۔ اول الذکر ترقی پسند ادب کی سیاسی وابستگی اور یک سطحی عام فہم اسلوب کے برخلاف علامتیت و تجریدیت کی سفارش کرتے ہیں اور اس ضمن میں ایک

حد تک ادبی تخلیقات میں ابہام کے قائل ہیں۔ ان رسائل میں حسن اور افادے کی بحثیں اکثر و بیشتر اٹھتی رہی ہیں۔ ان رسائل کے مدیران کا خیال ہے کہ ادب اور آرٹ کا مقصد اول جمالیاتی ذوق کی تسکین ہے اور اگر کوئی ادب پارہ اس شرط کو پورا نہیں کرتا تو وہ محض پروپیگنڈہ ہے' آرٹ نہیں۔ بعض اداریوں میں وقتاً فوقتاً زبان و ادب کی صورت حال پر تبصرے بھی ملتے ہیں۔ آخر الذکر قسم کے رسائل کے اداریوں میں جدیدیت کو اپنانے کے ساتھ ساتھ ابہام پسندی سے احتراز کرنے پر زور دیا گیا ہے اور ادبی تخلیق کے معاملے میں میانہ روی کو فوقیت دی گئی ہے۔

غیر وابستہ رسائل کے اداریوں میں ادبی دنیا کے واقعات و حادثات زیر بحث آئے ہیں۔ ذیل میں ہم ان رسائل کے اداریوں کا فرداً فرداً جائزہ پیش کرتے ہیں :

"شاہراہ"

"شاہراہ" کے اداریے "راہ نما" کے عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں جن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں پر تبصرے' حالات حاضرہ پر تبصرے' قومی اور بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ' ترقی پسند مصنفین سے متعلق خبریں' جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان اداریوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن میں سامراجی طاقتوں کی گھناؤنی سازشوں پر تنقید کی گئی ہے۔ مدیران نے اپنے اداریوں کے ذریعے بار بار اپنے قلمکاروں کو سائنسی عقلیت پسندی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ساحر لدھیانوی افتتاحی شمارے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کا اعادہ کرتے ہوئے کھوکھلی روحانیت بے بنیاد تصور پرستی اور دیگر منفی رجحانات کے خلاف قلم کاروں کو صف آرا ہونے کی دعوت دی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ سائنسی عقلیت پسندی کا فروغ ماضی پرستی و مختلف تعصبات کی روک تھام اور استحصال کے خلاف تعمیری ادب تخلیق کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

"شاہراہ" چوں کہ ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا لہٰذا دیگر مشتملات کی طرح اس کے اداریوں میں بھی اشتراکی نظریات کی اشاعت مدیران کا اولین مقصد رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت' مزدوروں اور غریب عوام کی ابتر صورت حال کا ذکر' سرکار کے عوام مخالف انداز حکومت پر نکتہ چینی خاصی طور پر کی گئی ہے۔ مثلاً شمارہ ۲ ج ۱ میں شاہراہ کی اشاعت کا مقصد اور ادیبوں کے متنوع مسائل حل کرنے کے بیان کے علاوہ ترقی پسند عناصر کے فروغ

میں خلل انداز ہونے والے سرکاری افسروں کی پالیسی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ترقی پسند عناصر کو کچلنے والے سیاسی اداروں کی پالیسی کی مذمت، رجعت پرستوں کے ہندی زبان کو قومی زبان قرار دے کر اردو ہندی تنازعہ کو فروغ دینے اور ہندوستانی مذاہب، کلچر اور زبان کی آڑ لے کر عوام کو گمراہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔

جلد ۲ ش ۳-۴ : بمبئی میں مزدوروں کے شاعر امیر شیخ، پنجاب کے بلیر سنگھ، ہرنام سنگھ، بنارس کے امرت رائے، اردو کے یوسف متان، نیاز حیدر اور ہنس راج رہبر کی گرفتاری پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔

ج ۲- شمارہ ۱-۲ : پاکستان میں شدید مخالفت کے باوجود ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں کا ذکر۔

مئی ۱۹۵۰ء : عوام کی اجتماعی زندگی میں ناہمواری پیدا کرنے والی امریکی طاقت اور اس کی خونی سازش کے خلاف ترقی پسند ادیبوں سے آواز بلند کرنے کی اپیل۔

جون ۱۹۵۰ء : ایٹمی ہتھیاروں پر بین الاقوامی سطح پر قابو پانے کے لئے جدوجہد کرنے والی تنظیموں کا ذکر۔

جولائی ۱۹۵۰ء : اٹھارہ جون ۱۹۵۰ء کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی مختلف شاخوں کی طرف سے گورکی کی برسی منانے کا ذکر۔ گورکی کے فن اور زندگی پر تبصرہ اور ۱، ۲، ۳، جولائی کو انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی کے انعقاد کا اعلان۔

ستمبر ۱۹۵۰ء : ۱۲ر اگست ۱۹۵۰ کو اودھی کے شاعر تلسی داس کا انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے یوم پیدائش منانے کا ذکر اور امن قائم کرنے میں شاعروں، ادیبوں کی ادبی خدمات کا ذکر اور اس پر اظہار مسرت۔

نومبر ۱۹۵۰ء : ترقی پسند مصنفین کی تحریک امن کی سرگرمی کا ذکر اور ایٹم بم کے خلاف آواز اٹھانے کی ترقی پسندوں سے اپیل۔

جون ۱۹۵۱ء : پاکستانی رجعت پرستوں کی سازشوں (امریکی اور برطانوی سامراج سے مل کر تیسری عالم گیر جنگ کی کاروائی) کو بے نقاب کرنے والے شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، حمید اختر، فیض احمد فیض اور ممتاز الحسین جو پاکستان میں نظر بند تھے، کی رہائی کا مطالبہ۔

نومبر ۱۹۵۱ء : حکومت کی جانب سے آزادی تحریر (پریس ایکٹ) پر اظہار مسرت۔
مئی ۱۹۵۲ء : ممتاز شیریں پر ان کے افسانے "ایسی پستی ایسی بلندی" پر چلائے گئے مقدے کی تفصیل۔
جولائی ۱۹۵۲ء : روسی ادب کی فروخت پر پابندی کرنے والی حکومت کی پالیسی کی مذمت۔
اکتوبر ۱۹۵۲ء اسرار الحق مجاز کا دماغی توازن بگڑنے پر قارئین شاہراہ سے ان کو مالی تعاون دینے کی اپیل۔
ستمبر ۱۹۵۲ء : ۱۲-۱۳ جولائی پاکستان میں انجمن کی منعقدہ کانفرنس کی تفصیل اور مقاصد کی نشاندہی۔
جنوری ۱۹۵۶ء : اسلم جیراج پوری اور مجاز کی موت پر ادارے کی طرف سے اظہار غم اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف۔ مئی ۱۹۵۶ء : ترقی پسند تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کی اپیل۔

اکثر اداریوں میں صرف شمارے کے مشتملات کا تعارف ہی پیش کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں "شاہراہ" کے ادبی اداریوں کا جائزہ پیش کریں گے۔

نومبر ۱۹۵۳ء : اس شمارے میں مدیر یوسف نے اپنے قلم کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج کل اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کے بارے میں ہمیں ایک بات کہنا ہے جس کی طرف بہت کم توجہ دلائی گئی ہے کہ ادیب کو عوام کے قریب جانا چاہیے۔ "عوام سے قریب" کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے اور اسی میں انحطاط اور جمود کا توڑ موجود ہے۔

مئی جون ۱۹۵۳ء : اس شمارے کے اداریے میں مخمور جالندھری نے بڑی معقول باتیں کی ہیں۔ انھوں نے ادیبوں میں پنپ رہے چند مضر رجحانات پر تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ بہت سے ادیب اپنی نگارشات میں بین الاقوامیت پیدا کرنے کے لئے غیر ممالک کے حالات و واقعات پر اپنے افسانوں اور نظموں کی بنیاد رکھتے ہیں جب کہ انھیں وہاں کی سیاسی سماجی، تہذیبی و ثقافتی صورت حال کا علم نہیں ہوتا۔ ایسی تحریریں ایک طرف بے اثر ثابت ہوتی ہیں دوسری طرف وہ حقیقت سے دور ہونے کی وجہ سے اعتبار حاصل نہیں کرتیں۔ یہی

حال ایک صوبے میں بیٹھ کر دوسرے صوبے کی مزدور تحریکوں پر قلم اٹھانے والوں کا ہے۔ بعض ادیب کسی مشہور مفکر کے اقوال کو افسانے کے کردار سے کہلوا دیتے ہیں یا نظریے کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے یہ نظم مادی جدلیت پر کہی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ مادی جدلیت پر لکھے گئے مقالے کا مطالعہ کرلیا جائے۔ اسی طرح کسی بڑی شخصیت کی موت پر لوگ قلم اٹھانے میں پہل کرنا چاہتے ہیں۔ یا کہیں سے نعرہ آتا ہے کہ فلاں تحریک کو اپنی تخلیقات میں جگہ دو۔ بس کچی پکی تحریروں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ اخبارات میں خبریں پڑھ کر لوگ وہاں کے بارے میں لکھ دیتے ہیں۔ جب کہ اس طرح کی خبروں کے لیے ضروری ہے کہ قلمکاروں کے بارے میں بذات خود وہاں رہ کر مطالعہ و مشاہدہ کرے۔ مشہور روسی ناول نگار تخوں سیاموشکن نے لکھا ہے کہ اسے چوکا سک کے لوگوں کے بارے میں لکھنے کے لئے وہاں آٹھ سال تک رہنا پڑا۔ مدیر لکھتا ہے کہ : ”ہر ادبی تخلیق کا سب سے بڑا حسن حقیقت پسندی ہے۔ حقیقت کے حسن میں تخیل 'ایجاد' اختراع کے چھینٹے چار چاند لگا سکتے ہیں۔“

اپریل ۱۹۵۴ء کے اداریے میں وامق جونپوری نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے کہ ایک ملک کی مجموعی قومی شناخت کے علاوہ علاقائی و طبقاتی شناخت بھی ہوتی ہے۔ اگر مختلف طبقے اپنی تہذیبی شناخت پر اصرار کرتے ہیں تو انھیں بزور طاقت کچلنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ان کی تحریکات کو طاقت سے دبایا تو جاسکتا ہے لیکن ختم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کسی دن دوگنی شدت سے ابھرے گی۔

مدیر مختلف صوبوں اور طبقوں میں اٹھنے والی لسانی تحریکوں کی حمایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ”حکومتیں ان تحریکات کو قومی مفاد کے خلاف اس لیے کہتی ہیں کہ کسی عوامی تحریک کو کچلنے کا یہ سب سے سستا اور آسان فاشستی حربہ ہے جو وقتاً فوقتاً استعمال ہوتا رہتا ہے۔“

فروری ۱۹۵۶ء کے اداریے میں فکر تونسوی نے اردو کے تئیں ہندی والوں کی معاندانہ اور متعصبانہ رویۂ پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ اردو ایک ترقی یافتہ تہذیبی ورثہ ہے اور ہندی ارتقا پذیر۔ اردو میں جو صلاحیتیں ہیں وہ صدیوں کی قومی تہذیبی کوششوں کا حاصل ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ اردو کی اس برتری کو تسلیم کرنے میں ایک بے معنی عصبیت بڑھتی جارہی ہے۔ جس کا مقصد ہے اردو والوں میں یاس انگیز خوف مسلط کرنا۔

اگست ۱۹۵۷ء کے ادارے میں محمد یوسف جامعی نے اشتراکی حقیقت نگاری کی آڑ میں 'سپاٹ' بے جان اور یکساں ادب پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کچھ شاعروں پر خطابت کا الزام آیا تو انھوں نے اس کے جواز میں ایک دل آویز غلاف پیش کیا' اور وہ غلاف تھا "صاحب ہم تو براہ راست قسم کی شاعری کے قائل ہیں۔" یعنی اپنے فن شعر میں دشنام طرازی' بے سری گھن گرج اور زخم سماعت دھوم دھڑکے پر.... اپنے دلائل کو اور بھی مضبوط بنانے کے لیے انھوں نے "اشتراکی حقیقت نگاری" کی آڑلی.... انھوں نے اشتراکی حقیقت نگاری سے یہ مراد لی کہ شاعر کو منہ پھٹ' دریدہ دہن' اور ہرزہ سرا ہونا چاہئے۔ اس طرح افسانہ نگاری کے میدان میں "مثبت پیرو" کی حسین و جمیل اصطلاح کو نقاب بنالیا گیا۔ افسانوں میں ایسے کردار پیش کئے گئے جیسے انھیں لکڑی سے تراشا گیا ہو۔ سیدھے اور سپاٹ انسانی جذبات سے عاری دکھ سکھ سے بے نیاز پتھر کے صنم۔ ہر افسانے کا انجام ہڑتال پر ہونے لگا۔ ہر افسانے کا مال یہ ضروری ہو گیا کہ "صبح ضرور ہوگی" افسانے میں ہڑتال کروادو۔ گولی چلوادو۔ ادیبوں کے ہاتھوں میں بندوق دیدو۔ محب کو جنگ میں بھیج کر محبوب کو وقف انتظار دکھادو۔ افسانوں میں لے دے کر یہی پلاٹ ملنے لگے۔ اس یکسانیت کے عیب کو چھپانے کے لیے "صحت مند رجائیت" کا غلاف اوڑھا گیا۔ اسی لئے سوویت روس کی کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سیکریٹری کامریڈ خروشچوف کو کہنا پڑا۔۔۔ "گذشتہ پندرہ برسوں میں ہمارے یہاں جو ادب پیش کیا گیا ہے اسے دیکھ کر ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔" اسی طرح بیسویں کانگریس کے اجلاس میں روس کے عدیم المثال ناول نگار ماتخیل شوتوخوف کو جدید ادبی رجحانات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا پڑی۔"

آخر میں مدیر نے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا ہے کہ کچھ ادیبوں نے اس بدعت کو پھیلنے سے روک لیا ہے اور وہ اندھی تقلید کے جال سے نکل رہے ہیں۔

ستمبر ۵۷ء کے ادریے میں مدیر یوسف جامعی نے مذکورہ بحث کو جاری رکھتے ہوئے اس بات پر مزید زور دیا ہے کہ ادب کو نظریاتی ایجی ٹیشن کا اکھاڑا نہ بنانا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں :

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے فنکاروں نے ترقی کی راہیں مسدود کی ہیں۔ ایک تحریک ایک جماعت یا ایک تنظیم کا علمبردار ادیب ہمیشہ محدود ہوتا ہے۔ اس میں آفاقیت بمشکل پیدا ہوتی ہے۔ دنیا بھر کے عظیم فنکاروں پر نظر دوڑائیے۔ وہ کسی

جماعت کے ادیب نہیں تھے۔ انسان دوستی ان کا بنیادی نظریہ تھا۔ انھوں نے اپنی بعض نظریاتی لغزشوں کے باوجود ایسا ادب پیش کیا کہ درست نظریہ رکھنے والوں کی تخلیقات ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتیں۔"

بعض اداریوں میں یوسف جامعی نے اردو ہندی تنازعہ کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ان اداریوں میں حکومت سے درخواست کی ہے کہ اردو کو دہلی، یوپی، بہار اور پنجاب میں صوبائی زبان کا درجہ دے۔

اکتوبر ۵۸ء کے اداریے میں مدیر یوسف جامعی نے اس بات کی تردید کی ہے کہ "شاہراہ" بے جان اور پس مردہ ہوگیا ہے۔ البتہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے انتشار کا اثر "شاہراہ" پر ضرور پڑا ہے۔ اور وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس میں کچھ اہم تبدیلیاں کرنی پڑی ہیں جو کہ ناگزیر تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ادب کی ترقی پسند اقدار کو فروغ دینے کے اپنے مشن کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔

دسمبر ۱۹۵۸ء : یوسف جامعی نے اپنے اداریے میں کہا ہے کہ آزادی کے بعد اگرچہ اردو کس مپرسی اور بد حالی کا شکار رہی لیکن اس کے باوجود اس نے پوری دیانت داری کے ساتھ اپنا حق ادا کیا ہے جو ایک زندہ اور متحرک زبان پر زمانہ، وقت اور حالات کے مطابق عائد کرتا ہے۔ مدیر اس الزام کی تردید کرتا ہے کہ گذشتہ دس بارہ برس کے عرصے میں تخلیق کیا گیا سارے کا سارا ادب محض پروپیگنڈہ ہے اور سارے ترقی پسند ادیب ہیجانی کیفیت کا شکار تھے۔ مدیر اس بات سے بھی انکار کرتا ہے کہ ادیبوں پر آج انجمادی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ آخر میں اس بات پر افسوس کیا گیا ہے کہ اردو کے مستقبل سے مایوس ہو کر کچھ ادیب ہندی کے طرف راغب ہو گئے ہیں۔ ہندی میں لکھنا بری بات نہیں لیکن اردو کے تئیں اپنی ذمہ داری کو فراموش کرنا ضرور بری بات ہے۔

"تحریک"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اشتراکی ادب اور کمیونزم کی مخالفت کے لئے "تحریک" کا اجراء عمل میں آیا تھا اور اس کے لئے سرمایہ امریکہ سے فراہم کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ ایک مفروضہ ہی ہے کیوں کہ ایسا کوئی ثبوت اب تک سامنے نہیں آیا جس سے اس الزام کی

تصدیق ہو سکے۔ یہ ممکن ہے کہ "تحریک" ترقی پسند تحریک کے رد عمل کا نتیجہ ہو لیکن یہ رد عمل کسی غیر ملکی طاقت سے بھی اپنا رشتہ رکھتا تھا۔ یہ محض قیاس ہی ہے۔ تاہم تحریک کے اداریوں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس جریدے کا واحد مقصد اشتراکی نظریوں اور ان کی بنیاد پر تخلیق کئے گئے ادب کی مخالفت کرنا تھا۔ اور اس کے مقابلے میں ایسے ادب کو فروغ دینا جو کسی خاص نظریے یا سیاسی عقیدے کا ترجمان نہ ہو اور نہ وہ کسی کے اشارے پر تخلیق کیا گیا ہو۔ اشتراکیت کے مادی جدلیت اور تاریخی جدلیت کے مقابلے میں اس جریدے نے انسانی قدروں کی آفاقیت اور پائیداری پر زور دیا اور ادب کے جمالیاتی پہلو کو زیادہ اہمیت دی۔ بیشتر اداریوں میں ادارے کے مشتملات کا تعارف پیش کیا گیا ہے جب کہ بہت سے اداریوں میں ترقی پسند نظریہ ادب، ادیبوں اور اشتراکی حکومتوں پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ مثلاً :

جون ۱۹۵۷ء : ترقی پسند تحریک سے ٹیگور اور منشی پریم چند کی وابستگی کو خارج از عقل قرار دیا گیا ہے۔ مدیر کا کہنا ہے کہ پریم چند نے تحریک کی پہلی کانفرنس کی صدارت ضرور کی تھی لیکن انھوں نے اس میں جو تقریر کی تھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ہمنوا نہیں تھے۔ مثلاً انھوں نے کہا "ایک انتہا پسند محتسب جو دوسروں پر اپنے عقائد ٹھونستا ہے ایک آوارہ مَنِش کے مقابلے میں واقعی زیادہ خطرناک ہے۔" علاوہ ازیں وہ ادب کو کسی مخصوص طبقے کا جبہ بردار بنانے کے مخالف تھے۔ لہٰذا ان دلائل کی روشنی میں پریم چند کو کسی بھی طرح تحریک کا حامی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ان کو دیگر حضرات کی طرح کمیونسٹوں کے متحدہ محاذ کے نعروں سے گمراہ ہونے والا کہا جا سکتا ہے۔

مئی جون ۱۹۵۸ : اس اداریے میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی باگ ڈور ہمیشہ سیاسی لوگوں کے ہاتھ میں رہی۔ اس تحریک نے خالص سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے متعدد رنگ بدلے اور دانشوروں کو گمراہ کرنے کے لئے نئے نعرے ایجاد کئے۔ ان نعروں نے نوجوان قلمکاروں کے ساتھ ساتھ پرانے لکھنے والوں کو بھی متوجہ کیا۔ یہ ایک خالص سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد چین کی طرح ہندوستان میں بھی سرخ انقلاب لانا تھا۔ مگر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

دسمبر ۱۹۵۸ء : "نیا جال لائے پرانے شکاری" کے عنوان سے یہ بات واضح کی گئی

ہے کہ ترقی پسند تحریک اپنی حکمت عملی سے دانشور طبقے کی صلاحیتوں کو جابرانہ سیاسی قوتوں کے ہنگامی اغراض ومقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اس تحریک کی بنیاد ہر جگہ ایسے لوگوں کے ذریعے ہی پڑی جو علم وفن کے بجائے سیاست سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تمام امور کی تصدیق کے لئے ۱۹۳۶ء سے اب تک کی مختصر مدت میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے مرکزی قائدین کے رویے کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہوگا۔

اکتوبر ۱۹۵۹ء کمیونسٹ نعروں کا ساتھ دینے والے ہر ناقد، افسانہ نگار، شاعر وغیرہ کو اس تحریک نے عظیم فنکار قرار دیا۔ ان فن کاروں میں ایک نام نیاز حیدر کا ہے۔ جن کو ان کے اشعار کی وجہ سے اس تحریک نے عظیم فنکار تسلیم کیا۔ نیاز حیدر کے عظیم اشعار میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔

اندھی دولت کا تیرے پر کاش : اہل زر کا فقیر ہے پر کاش

اس اداریے میں اردو والوں کو اس افراتفری کی داخلی طور پر اصلاح کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔

نومبر ۱۹۵۹ء : ۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت کے ''ہماری زبان'' کے اداریے کو بنیاد بنا کر اسے کمیونسٹوں کا ترجمان اور ذہنی مغالطوں میں مبتلا بتایا گیا ہے۔

دسمبر ۱۹۵۹ء : مدیر لکھتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کی سرحدوں پر یلغار ہو رہی ہے اور ہر ہندوستانی تمام اختلافات کو بھلا کر ملک کی آزادی اور سالمیت کا خواہاں ہے۔ مگر ترقی پسند تحریک کا ترجمان ایک شاعر کہتا ہے :

اس طرف روس اُدھر چین ملایا برما
اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

اس شعر کی پشت پر جو جذبہ کارفرما ہے اسے تمام ترقی پسندوں کے دل کی آواز بتایا گیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء : اس شمارے کے اداریے میں ترقی پسندی کے بنیادی نظریے سے جگر مراد آبادی کے اظہار بیزاری کا ذکر ہے۔ مدیر لکھتا ہے کہ جب ملک کی تقسیم کے بعد ترقی پسندوں نے جگر کی شہرت سے اپنے لئے فائدہ حاصل کرنا چاہا اور کسی طرح اپنی کانفرنس کے ایک مشاعرے کے لئے انھیں راضی کر لیا تو جگر نے اس مشاعرے کی صدارت تو کی لیکن یہ شعر پڑھ کر اس تحریک کے نظریے سے اپنے اختلاف اور بیزاری کا اظہار بھی کر دیا۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

دسمبر ۱۹۶۰ء : مدیر نے ترقی پسند تحریک کے نظریات کے کھوکھلے پن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ آخری دم تک مجاز شراب سے نجات نہیں پاسکے لیکن آخری ایام میں وہ ترقی پسندی کے نشے سے ضرور وہ بیزار ہوچکے تھے اور انھوں نے اس سے نجات حاصل کرلی تھی۔ مجاز سنجیدگی سے اس کا اظہار نہیں کرسکے مگر متعدد لطیفے اور ان کے طنزیہ فقرے اس راز کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ ترقی پسندی کے مخالف ہوچکے تھے۔

اگست ۱۹۶۱ء : کمیونسٹ اپنی ثقافتی سرگرمیوں میں آزاد ملکوں کے ان فنکاروں کو شریک کرتے ہیں جو فنی صلاحیتوں سے محروم اور شہرت کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ اور شہرت کا لالچ دے کر وہ ان لوگوں سے اس قسم کی قصیدہ گوئی باسانی کرالیتے ہیں :

مئی ۱۹۶۸ء اس اداریے میں ترقی پسندوں کو دور ُخا کہا گیا ہے کیوں کہ وہ ایک طرف تو حکومت ہند سے انعامات و خطابات حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف ان ترقی پسندوں کو طعنہ دیتے ہیں جو ترقی پسندی کے زعم میں وطن دوستی کی راہ سے منحرف نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر ترقی پسند شاعروں کے امام نیاز حیدر (جنکو کسی وقت سردار جعفری فیض پر ترجیح دیتے تھے) ۱۶ر اپریل کے مشاعرے میں کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ ساغر نظامی پر بھی برسے۔ ساغر نظامی سے خفا ہونے اور ان پر عقاب کا سبب یہ تھا کہ ساغر نظامی نے ”نہرو نامہ“ لکھا تھا۔

جولائی ۱۹۷۴ء : اس شمارے کے اداریے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ لوگوں کا ادب میں کوئی مقام نہیں تھا۔ بلکہ یہ لوگ صرف نعرے بازی تک ہی محدود تھے۔ مدیر لکھتا ہے کہ گذشتہ دنوں دلی میں ترقی پسندوں کے ایماء پر دلی کی ایک انجمن نے اس جستجو میں ایک میٹنگ بلائی تھی کہ ترقی پسندوں کے امام سجاد ظہیر کا اردو ادب میں کیا مرتبہ ہے۔ اس میٹنگ میں زیادہ تر حاضرین نے یہ رائے ظاہر کی کہ اردو ادب میں سجاد ظہیر کا کوئی مرتبہ اور مقام ہے ہی نہیں۔ مدیر لکھتا ہے۔ ”یہ وہی سجاد ظہیر ہیں جن کی ہیبت سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے عروج کے زمانے میں ادیب اور شاعر لرزہ براندام رہا کرتے تھے۔“

جون ۱۹۷۵ء : اس اداریے میں بتایا گیا ہے کہ ترقی پسند مصنفین کو اپنی ذات پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ نہ تو اپنے خدوخال کی بے پردہ نمائش کی تاب لا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے عزائم کو کھل کر بیان کر سکتے ہیں۔ یہ انجمن کمیونسٹ پارٹی کا معاون دستہ ہے۔ یہ لوگ اپنی دوکان چمکانے کے لئے ایسی شخصیتوں کی بھی آڑ لیتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ان کی ہمنوا نہیں تھیں بلکہ جنھیں ترقی پسندوں کے بنیادی اغراض و مقاصد سے بھی اختلاف تھا۔

مذکورہ بالا اداریوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ "تحریک" کا واحد مقصد ترقی پسند تحریک کی مخالفت اور جدیدیت کے لئے فضا ہموار کرنا تھا۔ جن اداریوں میں ادبی مباحث اٹھائے گئے ہیں ان میں بھی تان ترقی پسند نظریات کی مخالفت و تنقید پر ہی آ کر ٹوٹتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے اداریے :

مارچ ۱۹۵۳ء "تحریک" کے اجراء کا مقصد بیان کرتے ہوئے مدیر لکھتا ہے کہ : "یہ ایک ادبی پرچہ ہے اور ادب کا بنیادی مقصد ہے احساس جمال کی تسکین اور تربیت لیکن ادب احساس جمال کی تسکین اور تربیت کا فریضہ اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے جب اسے زندہ رہنے کی فرصت ملے اور چوں کہ ہندوستان میں اردو زبان، ادب اور کلچر کے زندہ نہ رہنے کا خطرہ موجود ہے اس لیے وہ ادب دشمن ماحول پیدا نہ ہونے دینے کی جدوجہد کرے گا۔"

ستمبر ۱۹۵۴ء : اس اداریے میں ادبی اور غیر ادبی تنقید کے عنوان سے بڑی معلوماتی بحث کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح برطانیہ میں ہر وقت کسی بادشاہ یا ملکہ کا ہونا ضروری ہے اسی طرح اردو دنیا بھی کسی بڑے شاعر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دراصل یہ غلطی اس لئے ہوتی ہے کہ وہ حضرات ادبی دور کا مفہوم نہیں سمجھتے ہیں کیوں کہ ادبی ارتقاء کے مراحل میکانیکی انداز میں نہیں بدلتے اور نہ ہی ادبی ادوار معین وقفے کے بعد بدلا کرتے ہیں۔ کسی شاعر کو ہم اس لئے عظیم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے دوسرے ہم عصر شعراء اس سے بھی گھٹیا شعر کہتے ہیں۔ میر، غالب اور اقبال میں کتنا زمانی بعد تھا۔ درمیانی وقفے میں متعدد اچھے شعراء ہوئے لیکن اس میں سے کسی کو بھی عظمت کا تاج نہ مل سکا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم ان شاعروں کے کلام سے لطف اندوز نہ ہوں یا ان کے کمال فن ہی سے انکار کر دیں۔ اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ہر اچھے شاعر کو عہد آفریں قرار دینا

ضروری نہیں۔

مئی ر ۱۹۵۵ء : "بیادِ اقبال" کے عنوان سے لکھے گئے اس اداریے میں اقبال کے فن پر معلوماتی بحث کی گئی ہے۔ مدیر لکھتا ہے کہ اقبال ایک عہد آفریں شاعر تھے۔ ان کو صرف مفکر کہنا ان کے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔ ان کا مقام مفکر سے بہت اونچا ہے۔ ان کے نظریات کی بنیاد عقلی استدلال پر نہیں بلکہ حیات و کائنات کے وجدانی عرفان پر تھی لیکن ان کے نزدیک عقلیت سے بیزار کا مطلب ذاتی فکر و عمل سے محروم ہونا نہیں تھا۔ وہ عقل کے اس حد تک مخالف تھے جہاں وہ اپنی حدود سے تجاوز کرکے زندگی کی ان مستقل اقدار پر حملہ آور ہوتی ہے۔ جو اس کی دست رس سے باہر ہیں۔ مدیر آگے لکھتا ہے کہ چوں کہ اقبال کا ذہنی ارتقا اسلامی روایات کے پس منظر میں ہوا تھا۔ اس لیے ان کی شخصیت کو اس پس منظر سے الگ کرکے دیکھنے پرکھنے کی کوشش غلط اور بے نتیجہ ہوگی۔

ان مباحث کے علاوہ وقتاً فوقتاً اس جریدے میں ایسے اداریے بھی لکھے گئے جو ہمعصر سیاسی و سماجی حالات پر مبنی ہیں۔ مثلاً مراد آباد، دلی اور یوپی کے مختلف شہروں میں ہونے والے فسادات، بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی وغیرہ۔ بعض اداریوں میں محض شمارے کے مشتملات کا تعارف ہے۔ کہیں کہیں اس بات کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ "تحریک" کے ذریعے بہت سے نوجوان اور ادیب گمراہ ہونے سے بچ گئے۔

"عصری ادب"

"عصری ادب" کے اداریے ہم عصر سیاسی، سماجی اور ثقافتی موضوعات پر لکھے جاتے ہیں۔ بعض اداریوں میں بین الاقوامی واقعات کا عکس نظر آتا ہے۔ جب کہ کچھ اداریوں میں شمارے کے مشتملات کا ذکر ملتا ہے۔ اکثر اداریوں میں ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کوئی ادب خلاء میں تخلیق نہیں ہوتا۔ اس کی جڑیں اسی زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور وہ سماجی زندگی سے اپنی نشو و نما کے لئے غذا فراہم کرتا ہے۔ ازیں سبب ایک فن کار بہتر ادب اسی وقت پیش کر سکتا ہے جب اس کی نگاہ خارج میں لحظہ لحظہ ہونے والی تبدیلیوں پر رہے اور وہ گہرائی میں جاکر حادثات و واقعات کی حقیقتوں کو تلاش کرنے کی اہل ہو۔ مدیر نے پروپیگنڈہ ادب سے برائت کا اظہار کرتے ہوئے بار بار اس امر پر بھی زور

دیا ہے کہ ادب میں بہر طور جمالیاتی عنصر کا وافر مقدار میں موجود ہونا ضروری ہے۔ وہ ادب میں ادیب کی ذاتی کیفیتوں کے اظہار کو تسلیم کرتے ہیں لیکن سماج اور اس کی حقیقتوں سے چشم پوشی اختیار کرنے کے بھی سخت مخالف ہیں۔ اس طرح بظاہر وہ ایک معتدل راہ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''عصری ادب'' کے بعض نمائندہ اداریوں کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

جنوری ۱۹۷۰ء : اس اداریے میں رسالے کے اجراء کا مقصد بیان کرتے ہوئے مدیر لکھتا ہے کہ ادب اور زندگی کے عصری رشتے ''عصری ادب'' کی اشاعتوں کا موضوع ہیں۔ ہر اشاعت میں چار عنوان ہوں گے ''تذکرے'' کے تحت عصری زندگی زیر بحث آئے گی۔ تبصرے کے تحت ہر سہ ماہی میں شائع ہونے والے اہم مضامین اور تخلیق فن پاروں اور ہندوستانی وغیر ملکی ادب کے اہم فکری میلانات کا جائزہ لیا جائے گا۔ عوام کو متاثر کرنے والے دوسرے ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن، اسٹیج وغیرہ کے ذریعے جو کچھ پیش کیا جارہا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اہم اردو کتابوں پر تبصرہ بھی اسی حصے میں شامل ہوگا۔

اس رسالے کا مقصد محض معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ جمالیاتی کیفیت کی باز آفرینی ہے۔ پہلے ورق سے آخری ورق تک سب کچھ پڑھنے کے بعد اگر اس جمالیاتی کیفیت کا ایک ہلکا سا پرتو بھی قارئین تک پہنچا تو ہم اسے اپنی کامیابی تصور کریں گے۔

مارچ ۱۹۷۲ء : اس شمارے میں مدیر نے ملک میں مختلف سطحوں پر پیدا ہونے والے انتشار پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھا ہے کہ ابتر اقتصادی صورت حال کے باوجود ہندوستان چین اور پاکستان سے ۴ لڑائیاں لڑ چکا ہے۔ حکمراں جب چاہتے ہی ان ملکوں کی امیج عوام کی نظروں میں گرادیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ان کی تعریف پر آمادہ کردیتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۲ء : مشتملات کا تعارف کراتے ہوئے آئندہ بہتر تخلیقات پیش کرنے کی خواہش کا ذکر کیا ہے۔

جون ۱۹۷۳ء : اس اداریے میں کہا گیا ہے کہ سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ علم و دانش کا عموماً اور اردو ادب کا خصوصاً اپنے دور کے عوام سے رشتہ ٹوٹ سا گیا ہے حالاں کہ اس کی سخت ضرورت ہے۔

جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء : ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کی وجہ سے اظہار پر بھی پابندی لگادی گئی تھی جس کی وجہ سے ادب میں اشاریت کو فروغ ملا۔ مدیر قلمکاروں کو حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی تلقین کرتا ہے۔

جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء : جدیدیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مدیر لکھتا ہے کہ دس سال پہلے جس جدیدیت کا بول بالا تھا وہ اب کہیں دکھائی نہیں دیتی سب کا زور ختم ہوچکا۔ آخر کار تجریہ پسندی پر عقل کا تسلط قائم رہا۔

جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۸ء : اس شمارے کے اداریے میں مدیر لکھتا ہے کہ آج ادب کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اور جو تحریریں سامنے ہیں ان میں سے اکثر کھوٹے سکے ہیں۔ اگر کھرا پن آئے گا تو اپنے گردو پیش کے واقعات سے آئے گا۔

اپریل تا جولائی ۱۹۷۳ء : اداریہ نویس لکھتا ہے کہ تیرہ برس قبل "عصری ادب" جب نکالا گیا تھا تو چار مقاصد سامنے رکھے تھے۔ ۱۔ ضمیر کی خریداری کے دور میں سربلندی قائم رکھی جائے ۲۔ اردو ادب کی سرحدیں وسیع ہوں ۳۔ دیگر ہندوستانی زبانوں اور مختلف طبقوں سے اردو زبان و داب کا رشتہ جوڑنا ۴۔ بین الاقوامی ادب سے اردو کو ہم آہنگ کرنا۔ یہ مقاصد اس لئے بتائے گئے تاکہ قارئین کو رسالے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا پتہ چل سکے۔

مذکورہ اداریوں سے "عصری ادب" کا مجموعی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ رسالہ جاری ہے اور صحت مند ادب کی اشاعت کا فریضہ انجام دینے کی اپنی سی کوشش میں مصروف ہے۔ پروفیسر محمد حسن کی سعی پیہم اس کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ رسالے کے اداریے قارئین میں عصر حسیت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

عصری آگہی

عصری آگہی کے مدیر پروفیسر قمر رئیس ترقی پسند ادبی تحریک کے مخلص کارکنوں میں سے ہیں۔ ابتدا ہی سے انھوں نے ادب میں ترقی پسندی کے عناصر کو فروغ دینے کی جدوجہد کی ہے۔ جس وقت جدیدیت کے زیر اثر ادب پر علامتی و تجریدی اسلوب کا غلبہ ہوا اور تخلیقات میں تہہ داری پیدا کرنے کے لئے ابہام کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس وقت فیشن کے آگے

ترقی پسندی کی چمک ماند پڑ گئی اور بازار میں جدیدیت کا سکہ چلنے لگا۔ اس موڑ پر آکر ترقی پسند ناقدین جو اب تک دفاعی تنقید لکھ رہے تھے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جدیدیت ترقی پسندی کی ضد نہیں بلکہ اس کی توسیع ہے۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ جدیدیت کو اپنے صفحات پر جگہ دیئے بغیر کوئی ادبی جرید سنجیدہ قارئین میں اعتبار حاصل نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ''عصری آگہی'' کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس نے اسے ایک غیر جانب دار پرچہ بتایا ہے :

جلد ا شمارہ ۹ کے اداریے میں مدیر لکھتا ہے : ''یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔'' آگے مدیر نے گزشتہ دہائی کی ادبی صورت حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ترقی پسندی کے خلاف ہر وہ تحریر جس میں ابہام تھا۔ بے چہرگی تھی اور تنہائی تھی، رد کر دی جاتی تھی۔ (ترقی پسندوں کے یہاں) لیکن اب جدیدیوں نے اپنی اصلاح کر کے اپنے یہاں سماجی واقعیت نگاری کو بھی جگہ دیدی ہے لہٰذا ایسی تحریریں چھاپنے میں ''عصری آگہی'' نے اگست ستمبر ۱۹۷۹ء کے مختلف رسائل کی دوغلی پالیسی کا ذکر کیا ہے۔ کہ وہ دعویٰ تو غیر جانب داری کا کرتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔ جو بات مدیر نے دوسروں کے بارے میں کہی ہے وہ ان پر بھی صادق آتی ہے کیوں کہ ''عصری آگہی'' کا کوئی بھی شمارہ اٹھالیجئے اس کے مشتملات چیخ چیخ کر آپ سے کہیں گے کہ ہم ترقی پسند ہیں۔

''عصری آگہی'' کے اداریے گہری عصری بصیرت اور حسیت کے غماز ہوتے ہیں چند اور اداریے دیکھیے :

مئی ۱۹۷۸ء کے اداریے میں قمر رئیس ادب میں سماجی حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں : ''چوں کہ مختلف تجربات و احساسات اور جذبات کے بعد ادب وجود میں آتا ہے۔ اس لئے ادب اپنے عہد کی آگہی کا سب سے معتبر ذریعہ ہے۔''

جون ۱۹۷۹ء : اس اداریے میں بتایا گیا ہے کہ آزادی کے بعد معاشی بحران سے توجہ ہٹانے کے لئے عوام کا رخ فرقہ وارانہ کشیدگی کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

جولائی ۱۹۷۹ء کے شمارے میں مدیر نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ہندی والے پریم چند کو خالص ہندی کا ادیب ہی کہہ رہے ہیں اور اردو سے انھیں لاتعلق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا اردو والے اس کا جواب نہیں دیں گے؟

جلد ۱ شمارہ ۱۰ : قارئین کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اس فرمائش اور مطالبات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ "عصری آگہی" میں آج کے پیچیدہ سماجی رشتوں اور پہلودار ذہنی رویوں کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

جلد ۲ شمارہ ۳ اس ادارے میں مدیر نے افسانے کی بڑھتی ہوئی پذیرائی پر اظہار اطمینان کے ساتھ کہا ہے کہ افسانے کی یہ مقبولیت ان لوگوں کو چونکا دینے کا باعث ہے جو شاعری اور شاعری کی تنقید ہی کو ادب سمجھتے ہیں۔ مدیر لکھتا ہے کہ یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ آج اکثر ناقدین افسانے کی تنقید کی طرف بھی راغب ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض اداریوں میں ہمعصر سیاسی و سماجی صورت حال پر تبصرے بھی شامل ہیں۔

تخلیق :

وشوناتھ درد کی ادارت میں شائع ہونے والے اس پرچے کے صرف تین شمارے دستیاب ہو سکے ہیں۔ جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مدیر نے اپنے اداریوں میں کوئی ادبی بحث نہیں اٹھائی ہے۔ دوسرے شمارے میں وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ تخلیق کو ادبی سیاست سے محفوظ رکھا جائے گا۔ مدیر لکھتا ہے : "تخلیق کسی مخصوص مدرسہ فکر کی نمائندگی نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی کسی ادبی گٹ بندی کو ہوا دے گا۔"

تلاش :

یہ پرچہ بھی وشوناتھ درد کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موصوف نے بہت کم قیمت میں دو دو پرچوں کے ذریعے عوام تک معیاری ادب پہنچانے کی مخلصانہ کوششیں کیں۔ لیکن صرف اخلاص ہی تو کسی معیاری ادبی جریدے کی بقا کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے معقول مالی وسائل حلقہ قارئین ازبس کہ ضروری ہوتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد اردو کے قارئین کی تعداد میں کافی کمی واقع ہوئی۔ دوسری طرف ارباب اقتدار کا اردو کے تئیں متعصبانہ رویہ پھر بھلا ایک مجاہد اردو کہاں تک بے سروسامانی کی حالت میں محض اخلاص کے بل بوتے پر محاذ پر قائم رہ سکتا ہے۔ ناچار یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اردو کی اس ابتر صورت حال پر موصوف نے اپریل ۱۹۶۳ء کے شمارے میں زبردست اداریہ تحریر کیا جس میں انھوں نے اردو والوں کو یہ اعتراف کرلینے کا مشورہ دیا کہ آزادی کے بعد اردو کو ناجائز طور پر تقسیم کا ذمہ دار ٹھہراکر چونکہ راندۂ درگاہ کرنے کا منصوبہ بنایا جاچکا ہے اس لئے اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ پر امید ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر اردو والے قانونی تحفظ کو اردو کی زندگی کی ضمانت سمجھتے ہیں تو یہ ان کا خیال خام ہے۔

تلاش کے دستیاب شماروں میں سے صرف ایک میں اردو کے متعلق مدیر کے خیالات سے ہمیں آگاہی ہوسکی۔ دوسرا شمارہ جنوری تا اپریل ۱۹۶۴ء کا ہے، جس کو خاص نمبر کی حیثیت سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے اداریے میں صرف شمارے سے متعلق باتیں کی گئیں۔ اور مشتملات کا تعارف پیش کیا گیا۔ اگر یہ پرچہ جاری رہتا تو اردو ادب میں عمدہ تخلیقات کا اضافہ ہوتا اور مدیر کا دانشورانہ ذہن اداریوں میں یقیناً مفید نکات پیش کرتا۔

"محور"

اس پرچے کے دو شمارے ہمیں دستیاب ہوسکے۔ ایک ۱۹۶۶ء کی خاص اشاعت غالباً اگست کا شمارہ (ماہ اشاعت ندارد) اور دوسرا غالباً دسمبر ۱۹۶۶ء کا۔ دونوں پر آں جہانی کمار پاشی کے دستخط اور ان کے نیچے علی الترتیب ۷ر اگست ۶۶ء اور ۸ر دسمبر ۶۶ء درج ہے۔ اول الذکر شمارے کے اداریے میں مدیر ادیب کو کسی نظریاتی وابستگی سے روکتا ہے اور ساتھ ہی اقتصادی و سماجی مسائل سے چشم پوشی اختیار کرنے پر قلمکاروں پر تنقید کی ہے۔

آخر الذکر شمارے کا اداریہ بھی نریندر نشچل کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس اداریے کا اسلوب : پیچیدہ اور ایک تمثیل کو علامت کے طور پر استعمال کرکے دو ادبی گروہوں کی باہمی کش مکش کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آغاز یوں ہے !

"اور پھر یوں ہوا۔۔۔۔۔

عنکبوت کبیر اپنے گہوارۂ تعیش میں نسیم کی سحر آویز موسیقی میں سرشار معطر شبنم کی فردوسی فضا سے محظوظ ہورہا تھا۔ نازاں تھا کہ اس کا فرماں بردار عنکبوت صغیر اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔"

آگے کی حکایت یوں ہے کہ عنکبوت کبیر بہت خوش ہے کہ اس کے وفاداروں نے

ساری گلشن کو ویران کر کے ہر طرف جالے بچھا دیے ہیں۔ پیڑ پودوں کی ڈالیاں خشک ہو گئی ہیں لیکن ایک زبردست آندھی نے تمام جالوں کو ہوا میں اڑا دیا۔ عنکبوت کبیر فکر مند ہے کہ آقا کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ وہ اپنے دشمن یعنی گلشن کو برباد کرنے کا بیڑہ اٹھاتا ہے اور بھیڑ چھتوں کی طرف چل پڑی ہے۔ اس اداریے میں ایک کامیاب تخلیق کی صفات موجود ہیں جس میں تہ داری اور اشاریت دونوں موجود ہیں۔

"سطور"

یہ رسالہ ادیب کی مکمل آزادی کا علمبردار ہے :

"ظلمت، ریاکاری اور انسان کی بقا پر ایمان لانے کے بعد اگر ادیب مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا ہے تو کوئی بھی انتظامیہ اس مطالبے کو نامناسب کہہ کر رد نہیں کرے گا۔

(ص-۳، شمارہ-۱)

اسی اداریے میں مدیر اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ادب کو اشتہاری نہیں ہونا چاہیے۔

جلد ا شمارہ ۳ : اس اداریے میں مدیر نے جدیدیت کی آزاد اور کھلی فضاؤں کو قید خانوں تبدیل کرنے کی بعض ناقدوں کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ مدیر لکھتا ہے کہ بعض ناقد چاہتے ہیں کہ شعر و ادب ان کے ذہنی مفروضوں کے پابند ہو کر رہے ہیں۔ سطور ان حضرات کا ہمنوا نہیں۔

شمارہ؟ ۱۹۷۷ء : اس شمارے میں اس وقت کے مرکزی وزیر سکند بخت سے گزارش کی ہے کہ وہ کابینہ میں اس بات پر زور دیں کہ یوپی۔ دہلی اور بہار میں حکومت اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دے۔ مدیر اس بات سے متفق نہیں کہ اردو کی زبوں حالی میں حکومت کا ہاتھ ہے کیوں کہ اس نے اکیڈمیاں اور بورڈ قائم کر کے کروڑوں کی امداد کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اب اردو والے اس امداد کو قوالیاں اور مشاعرے کرانے میں صرف کر دیں یا اردو رسم خط سکھانے اور اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے میں—مدیر کا گلہ اردو کے علمبردار ادیبوں سے ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے۔

مدیر موصوف کا فرمانا اپنی جگہ درست ہے لیکن اگر حکومت اردو کے تئیں واقعی مخلص

ہے تو وہ اس کو دہلی- یوپی اور پنجاب میں ثانوی زبان کا درجہ دے- اردو کی نصابی کتابیں اسی تندہی اور دلچسپی کے ساتھ تیار کروا کے جس طرح ہندی انگریزی اور دیگر زبانوں کی- محض کچھ اداروں کو مالی تعاون دینے سے اردو کی ترقی نہیں ہوگی-

شمارہ مارچ تا مئی ۱۹۷۵ء میں مدیر نے ایک سوالنامہ پیش کیا تھا جس کا جواب دینے والوں میں کرشن موہن- کوثر چاندی پوری' بلراج کومل' پرکاش فکری' شرون کمار ورما' ڈاکٹر نریش اور شاہد میر شامل ہیں- سوال نامہ یہ ہے :

۱- کیا یہ سچ ہے کہ اردو زبان جسے ہندوستان میں بول چال کی عام زبان کی حیثیت حاصل رہی ہے' اب اپنی یہ حیثیت کھوتی جا رہی ہے؟

۲- اردو سے بڑھتی ہوئی بیگانگی کا سبب کیا ہے؟ دوسری باتوں کے علاوہ کیا اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موجودہ ماحول میں جب ہندی ملک کی قومی زبان بن چکی ہے' اردو والے ہندی والوں کے قریب جاتے ہوئے گھبراتے ہیں اور عربی و فارسی کے ایسے الفاظ پر اب بھی اصرار کرتے ہیں جو ایک عام ہندوستانی نہیں سمجھتا؟

۳- اردو رسم خط باقی رکھتے ہوئے اگر عربی و فارسی کے مشکل لفظوں کی جگہ ہندی اور دیگر مقامی زبانوں کو دے دی جائے جو اردو کے صوتی نظام سے مطابقت رکھتے ہوں تو کیا یہ اردو کو زندہ رکھنے کے لئے مفید نہ ہوگا؟

۴- چوں کہ اردو اور ہندی کو ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں سمجھا گیا ہے تو کیا ہم اردو کے مفاد میں حکومت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ ہندی کو دیوناگری لپی کے علاوہ اردو رسم خط میں لکھنے کا حق تسلیم کیا جائے اور اسکولوں میں دونوں رسم خطوں کی تعلیم دی جائے؟

۵- کیا آپ کو اس مطالبے سے اتفاق ہے؟ اگر ہاں تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) اور اردو والوں کی دوسری تنظیموں کو اس مطالبے کی حمایت پر آمادہ کیا جائے؟

بعد کے صفحات میں جوابات شائع کئے گئے ہیں جن میں مذکورہ بالا تجاویز و خیالات میں بیشتر سے اختلاف کیا گیا ہے اور تقریباً سبھی نے اس خیال کو مسترد کیا ہے کہ اردو عوامی زبان کی اپنی حیثیت کھوتی جا رہی ہے- ان حضرات کا خیال ہے کہ سیاست کی گندی سازشوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ حقیقت آج بھی عیاں ہے کہ شمالی ہند کے بیشتر عوام کی زبان اردو

ہے۔ (علاقائی زبانوں کو چھوڑ کر) تمام فلمیں اردو میں بنتی ہیں۔ ان کے ڈائیلاگ اور گانے اردو میں ہوتے ہیں مگر سیاست کی ستم ظریفی کہ انھیں ہندی سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ ان تمام حضرات نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اردو کو مٹانے کی سازش حکومتی سطح پر کی جارہی ہے اور ہندی والوں کا بھی ایک طبقہ اردو کے تئیں متعصبانہ جذبات رکھتا ہے۔ جس نے یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ اردو سرے سے کوئی زبان ہی نہیں ہے بلکہ یہ ہندی کی غیر فطری اولاد ہے۔ اس بے ہودہ خیال پر کوئی رائے اس شمارے میں پیش نہیں کی گئی ہے۔ لیکن راقم السطور کے نزدیک ہندی والوں کے اس متعصب گروہ کی بات کا جواب یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے بنی اس زبان کا نام ہے جو فارسی و عربی رسم خطوں میں لکھی جاتی رہی ہے۔ بعد میں جب اس کا نام اردو پڑ گیا تو انگریزوں کے اشارے پر اسی زبان میں عربی و فارسی کے مشکل الفاظ کی جگہ سنسکرت کے تسم الفاظ و تراکیب داخل کرکے دیوناگری رسم خط میں لکھنا شروع کردیا اور اسے اردو کے سابق نام ہندی سے موسوم کردیا گیا' غیر فطری طور پر تشکیل کی گئی اس زبان کی پہلی کتاب للولال جی نے لکھی جو ۱۸۰۲ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس نام نہاد زبان کی اردو کے مقابلے میں فوقیت ثابت کرنے کے لئے (جو کہ اس کے علمبرداروں کے احساس کمتری کا نتیجہ ہے) اور اس کا رشتہ زمانہ قدیم سے جوڑنے کے لئے پہلا کام یہ کیا گیا کہ اردو' برج' بھوج پوری' اودھی' راجستھانی' ہریانی اور بندیل کھنڈی وغیرہ کو ہندی کی بولیاں کہہ کر ان کی ادبی و لسانی روایات کو تاریخ ادب ہندی میں شامل کرلیا گیا۔ اور اس طرح یہ عظیم لسانی المیہ وجود میں آیا کہ آزاد اور باقاعدہ زبانیں ایک مصنوعی اور غیر فطری زبان کی بولیا قرار پائیں۔

۱۹۸۱ء میں سریندر پرکاش پر شائع کیے یک موضوعی شمارے کے اداریے میں مدیر نے ناقدین ادب کی اس بات پر گوشمالی کی ہے کہ انھوں نے شاعری کے مقابلے میں افسانے کی تنقید کو نظرانداز کیا ہے کیوں کہ شعر پر تنقید لکھنا بہت آسان ہے جبکہ فکشن کی تنقید کا کام جان جوکھوں کا ہے۔

اس کے بعد سریندر پرکاش کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کیا گیا ہے اور کہا ہے سریندر پرکاش نے اب تک ایسے کئی افسانے اردو دنیا کو دیے ہیں جو آنے والے کسی بھی دور میں بوڑھے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی چمک دمک میں اضافہ ہوگا۔"

آخر میں اردو کی صوبائی اکیڈیموں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ بجائے اپنے غیر معیاری رسائل نکالنے کے پہلے سے جاری معیاری رسائل کی مالی استعانت کریں۔

"سطور" کے اداریوں میں سنجیدگی کے ساتھ ادبی و لسانی مسائل پر اظہار خیال ملتا ہے اور خصوصیت اس کے معیار کو برقرار رکھنے میں معاون رہی ہے۔ کیوں کہ اداریے سے مدیر کا اپنے مشن کے تئیں کمٹ مینٹ اور وفاداری کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے اداریے کو دیکھ کر شمارے کے مزاج کو پرکھا جاسکتا ہے۔

"شعور"

"افق" کے عنوان سے لکھے جانے والے "شعور" کے اداریوں میں ہمعصر دانشوروں ادیبوں اور شاعروں پر عمومی تنقید شامل ہوتی ہے۔ پیرایۂ بیان دقیقی اور فلسفیانہ ہوتا ہے۔ یہ اداریے ایک مضمون کی طوالت رکھتے ہیں۔ جن میں ادب کی سماجیت کو فراموش نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور ہم عصر ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی منافقانہ روش پر طنز کے نشتر برسائے گئے ہیں مثلاً :

شمارہ ۱ میں علمی و ادبی شخصیتوں کے دوغلے پن پر روشنی ڈالتے ہوئے مدیر لکھتا ہے : "دوغلہ پن (Dichtomy) جو ہمارے عہد کی سماجی خصوصیت ہے، ہماری دانشورانہ زندگی کی بھی خصوصیت ہے۔ اس لئے آج کی صورت حال کو سمجھنے کے لئے اپنے عصر، عصری ادب اور عصری ادیبوں کی اس خصوصیت کا تجزیہ ضروری ہے۔" اس کے بعد اداریہ نویس ادبی شخصیتوں کے دوغلے پن کا تجزیہ کرتا ہے اس سلسلے میں سب سے زیادہ نزلہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ پر گرا ہے :

"اس ابتذال کا سب سے محفوظ اور شعور سوز مرکز یونیورسٹیاں ہیں۔ جو ادیب و شاعر یونیورسٹیوں میں جلیل القدر شخصیتوں کے مالک ہیں ان کی ادبی و سماجی زندگی کا جائزہ روح فرسا نتائج تک پہنچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ادب میں ایک عجیب بھُس قسم کی فضا پیدا کردی جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں علمی و ادبی کام کی فرصت نہیں، ان کا سارا وقت کیریر کو پرانے جوتوں کی طرح چمکانے میں صرف ہوتا ہے۔ لکچراری، ریڈری، پروفیسری نظم و نسق کے عہدے۔۔ پوری سیڑھی بنی

ہوئی ہے۔“

شمارہ-۲ میں اداریہ نویس پہلے تاریخی مادیت اور جدلیاتی مادیت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتا ہے کہ ”تہذیب سے انسان شروع نہیں ہوتا۔ انسان سے تہذیب شروع ہوتی ہے۔ تہذیب ہی نہیں تاریخ بھی۔ تہذیب بھی تاریخ کی دین ہے۔ تاریخ ہے کیا اگر انسان کی سماجی ارتقا کی دستاویز نہیں؟ تہذیب ہے کیا اگر یہ انسانی کے روحانی ارتقا کا مظہر نہیں۔ اس مظہر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ صرف فکروفن؟ صرف دانشوری و شاعری؟ رقص و موسیقی؟ یا اور بھی کچھ؟ اس کے بعد ضمیر کی دو رنگی کا ذکر کرتے ہوئے سچے ضمیر اور جھوٹے ضمیر کا موازنہ تاریخی حوالوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

”شعور“ کے اداریوں سے مدیر کی اپنے نظریات و خیالات نیز آدرشوں کے تئیں شدید وابستگی اور وفاداری کا اظہار ہوتا ہے وہ اپنے ہم عصر ادیبوں‘ شاعروں اور دانشوروں کی منافقانہ روش پر بے حد نالاں ہے اور اس صورت حال کو بدلنا چاہتا ہے۔

”معیار“

”معیار“ کی اشاعت کا مقصد جیساکہ اس کے اداریوں سے واضح ہوتا ہے‘ ایک ایسے ادب کی ترویج و اشاعت تھا جو زندگی کی گہری بصیرت و معنویت کا حامل ہو۔ جو اپنے سماج سے گہری وابستگی بھی رکھتا ہو اور انسان کے اندرون کی حقیقتوں کی بھی ترجمانی کرتا ہو۔ ”معیار“ کے اداریوں سے یہ بات سامنے آتی ہے اس کے ترتیب کار جدیدیت کی صحت مند خصوصیات کو ترقی پسند ادب کے اعلیٰ اوصاف سے ہم آمیز کر کے ایک متوازن راہ ادب پر قلمکاروں کو گامزن کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ایک طرف وہ اسلوب بیان پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف سماجی حقیقتوں کو نظرانداز نے کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

پہلے شمارے کے اداریے میں اداریہ نویس لکھتا ہے کہ ”ادب الفاظ کی ترتیب سے جنم لیتا ہے۔ لیکن ادب کے تخلیقی عمل میں لفظ کی معنویت کا تعین اپنے زمانے کے انفرادی اور اجتماعی تجربے اور بقدر اظہار اس تجربے سے اس لفظ کی وابستگی کی بدولت ہے....“

دوسرے شمارے میں سید احتشام حسین کے ایک مضمون ”ادب اور تہذیب“ سے ماخوذ اقتباس کو اداریے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے مدیران اپنے قارئین و

قلمکاروں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ وہی ادب آفاقی اور لافانی ہوتا ہے جو انسان دوستی کی قدروں کا محافظ ہوتا ہے۔

شمارہ۔۳ میں مدیر قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ "معیار" قلمکاروں کے اس گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جو ۱۹۷۰ء کے بعد کی صورت حال کے پروردہ ہیں۔ اور جو ٹیکنالوجی کے عروج کا دور ہے۔ جس نے انسان کے وقار کو بلند کیا ہے۔ یہ ذہن اپنے عہد کی تبدیلیوں سے متاثر ہے اور ان کی ترجمانی اپنے فن میں کرنا چاہتا ہے۔ "معیار" اسی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

"تناظر"

اس کتاب نما جریدے کی صرف پہلی اشاعت ہمارے سامنے ہے۔ یہ شمارہ جنوری ۱۹۸۰ء کا ہے۔ جس میں مدیر نے تناظر کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارا مقصد ادب کو تمام ادبی گروہ بندیوں سے آزاد کرنا ہے اور تجربے کی روایت کو آگے بڑھانا ہے اس لیے اس شمارے میں کچھ ایسے فنکاروں کی تخلیقات بھی شامل ہیں جو نسبتاً کم معروف ہیں۔ اداریہ نویس نام نہاد جدیدیت کا اتنا ہی کم قائل ہے جتنا نام نہاد ترقی پسندی کا۔ وہ ادب میں جمود کا قائل نہیں وہ چاہتا ہے کہ ایسا ادب تخلیق ہو جس کی جڑیں ماضی حال اور مستقبل سے ملی ہوں۔

"ذہن جدید"

ادب آرٹ اور کلچر کی ترجمانی کا دعویٰ دار یہ رسالہ اپنے اجراء کے وقت سے اب تک پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ مرتب کی کوششوں نے اس جریدے کی شان و شوکت میں بتدریج اضافہ کیا ہے۔ اس جریدے کے اداریے مرتب کے ادبی و ثقافتی رجحان کی عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زبیر رضوی جو کہ آج کل دہلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری بھی ہیں، ماضی میں ترقی پسند تحریک اور بعد میں جدیدیت دونوں سے وابستہ رہ چکے ہیں اور دونوں طرح کے ادبی ذائقے انھوں نے چکھے ہیں۔ لہٰذا ان کا موجودہ نظریہ ادب جدیدیت کی طرف جھکا ہوا ضرور ہے لیکن اس میں ترقی پسندی کے عناصر بھی ہم آمیز ہیں۔ اپنے اداریوں میں وہ ہندوستان اور بالخصوص اردو کے حوالے سے ادب، آرٹ اور کلچر کے شعبوں میں ہونے والی سرگرمیوں، تبدیلیوں اور اضافوں کے بارے میں ناقدانہ رائے کا اظہار

کرتے ہیں۔

پہلا شمارہ ستمبر، نومبر ۱۹۹۰ء : اس شمارے میں بتایا گیا ہے کہ فی زمانہ لوگ عوامی رابطے کے لئے بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کا مقصد ادب کو فائدہ پہنچانا ہے۔ "ہم یہ کیوں کہیں کہ ہم Gunuine لوگوں میں ہیں اور ذہن جدید کے اجراء کا مقصد اردو قاری کو ادب، آرٹ، کلچر کے عصری رویوں، رجحانات اور سرگرمیوں سے باخبر رکھنا ہے۔ ہماری اسی بات پر اردو قارئین نے یقین کیا تو ہمیں محسوس ہوگا کہ خون جگر رائیگاں نہیں گیا۔"

شمارہ مارچ تا مئی ۱۹۹۱ء : اداریہ نویس اپنی ہمت اور حوصلے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بے سروسامانی کے باوجود ہم میدان کارزار میں کود پڑے ہیں اور ہماری کوششوں کے بارے میں جو بھی رد عمل پیدا ہوا ہے وہ اس لئے اطمینان بخش ہے کہ وہ اردو کی درس گاہوں کی طرف سے نہیں ہے کیوں یہ طبقہ کب کا مرحوم ہو چکا ہے۔ مدیر کا کہنا ہے کہ ہم انعام و اکرام حاصل کرنے پر مبارک سلامت دینے والوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔ کیوں کہ ان میں غیر مستحقین او سطیوں کی تعداد زیادہ ہے۔

شمارہ ستمبر۔ نومبر ۹۲ء : قومی آواز کو دیئے گئے علی سردار جعفری کے انٹرویو پر تبصرہ کرتے ہوئے جعفری کے اس قول پر اعتراض کیا ہے کہ "جدید ادب" ترقی پسند ادب کا مقابلہ نہیں کر سکتا" مدیر لکھتا ہے کہ "ادب کا مطالعہ مقابلے کی آنکھ سے نہیں اس آنکھ سے ہونا چاہئے جو بصیرت اور بصارت کی حامل ہو۔

شمارہ ستمبر۔ نومبر ۹۳ء : اس شمارے میں ترتیب کار نے بڑے کام کی بات کی ہے کہ ساٹھ سال کے بعد جدیدیت کے زیر اثر ادب میں جس تازگی کا احساس ہوا تھا وہ اب ٹھہرے ہوئے پانی میں بدل چکی ہے۔ شاعری کی سطح پر خاص طور پر یکسانیت کا احساس ہونے لگا ہے "جب کہ افسانہ اپنے نئے ڈائمنشن کے ساتھ زندگی کے تنوع کو اس کے سرد و گرم اس کے تضاد اور ٹکراؤ کو بیانیہ کے حوالے کرنے میں خاصا مخلص ہے.... افسانہ تھکا ہوا نہیں ہے وہ چار سمتوں میں اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے۔"

بعض اداریوں میں اردو زبان و ادب کے دامن کو مزید وسیع کرنے کی بات کی گئی ہے نیز دوسرے زبانوں کے ادب سے خواہ براہ راست خواہ بذریعہ تراجم استفادہ کرنے کی طرف

بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

''ذہن جدید'' کے اداریے قارئین کو بلاشبہ سوچنے اور کچھ کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ادب کی صورت حال کا صحیح طور پر جائزہ پیش کرنے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو خوبیاں اور خامیاں ادب اور ادیبوں میں موجود ہیں ان کی طرف قارئین کا دھیان منعکس ہو۔ اور خوبیوں میں اضافے اور خامیوں کو دور کرنے کی شروعات ہو۔ادب کو صحیح سمت کی طرف موڑنا بھی ان اداریوں کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اداریہ نویس تمام صورت حال سے بخوبی واقف ہو اور اپنی تاریخ اور اسلاف کے چھوڑے ہوئے سرمائے سے نیز ارتقائی مراحل سے کماحقہ آگاہی رکھتا ہو۔

''کتاب نما''

''کتاب نما'' کے اداریے مہمان مدیروں سے لکھوائے جاتے ہیں۔ ان میں اردو سے متعلق صورت حال پر تبصرہ اور ادبی مباحث شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً فروری ۱۹۸۲ء میں اترپردیش حکومت کی جانب سے اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اعلان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس شمارے کے اداریے میں ایک اور اہم خبر یہ سامنے آئی کہ اس سال ساہتیہ اکادمی کی نظر میں اردو کی کوئی بھی تصنیف قومی ایوارڈ کے لائق نہیں سمجھی گئی۔ مدیر لکھتا ہے کہ ''دنیا پر اردو کی تہی دامنی ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

جون ۱۹۸۲ء : اس شمارے میں کانگریس پارٹی کے منشور میں اردو کے متعلق جو وعدے کیے گئے ان کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ بہار کو مبارک باد دی گئی ہے کہ انہوں نے بہار میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دے کر مستحسن قدم اٹھایا۔

بعض اداریوں میں اردو کی کتابوں پر دیئے گئے انعامات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ مہمان مدیروں کے لکھے ہوئے اداریے خاصے طویل ہوتے ہیں۔ ان میں چند کا تعارف پیش ہے۔

دسمبر ۱۹۸۷ء : مہمان مدیر آل احمد سرور۔ عنوان ''اردو زبان اور اردو کے ادیب''

اس اداریے میں اردو کی صورتِ حال پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اردو کو جدید آریائی زبان اور کھڑی بولی کو اس کی ماں بتاتے ہوئے اداریہ نویس لکھتا ہے کہ دستور ہند کے مطابق اردو کو جو ضمانتیں دی گئی ہیں ان پر حکومت بہت کم عمل پیرا ہے۔ اردو بولنے والوں کی صحیح تعداد نہیں

شائع کی جاتی۔ اعلیٰ تعلیم کا اردو ذریعہ تعلیم میں انتظام نہیں ہے۔ اردو کے اخبارات و رسائل کی اشاعت بہت کم ہے۔

اس مضمون کا بقیہ حصہ جنوری ۸۸ء کے شمارے میں بطور اداریہ شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ "اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں ایک چھوٹی سی تعداد کو چھوڑ کر علم اور اس کی ابتدا و ارتقاء پر نظر ہونی چاہئے۔" اردو میں جنوب ایشیائی، جنوب مشرقی ایشیا اور وسطی مغربی ایشیا کی تہذیب کے دھارے آکر ملتے ہیں۔ ان تمام تہذیبوں سے ہمارے ادیب کو واقف ہونا چاہئے۔ اور اردو سے قریب کی زبانوں سے بھی آگاہی ہونی چاہئے اس کے بعد موصوف نے نئے لکھنے والوں کی اکیڈمیوں اور دیگر تنظیموں کے ذریعے حوصلہ افزائی کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور نظریاتی اختلافات بھلا کر تمام قلمکاروں کو اردو کے تحفظ کے لئے متحد ہونے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔

فروری ۱۹۸۸ء : مہمان مدیر علی سردار جعفری، عنوان "دیکھ تو کس منزل طوفاں سے اٹھی ہے حیات۔" اس اداریے میں مدیر نے ہندوستانی تہذیب کے تاریخی ارتقا اور اس میں مسلمانوں کی شرکت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی تشکیل اور اس کے ہندوستانی بولیوں سے روابط اور اس کے ہندی النسل ہونے پر زور دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ہندو احیا پرستی کے چھوڑے ہوئے اس شوشے کی مذمت کی ہے کہ اردو غیر ملکی زبان ہے۔ آخر میں اقبال کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے کہ وہ برہمن زادے تھے اور ان کی تربیت اسلام کی آغوش میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اسلامی اور ہندی ذہنوں کی آویزش کا نتیجہ ہے اقبال کی حکیمانہ شاعری لہٰذا وہ ہندی النسل ہے نہ کہ غیر ملکی۔ جعفری کا یہ مضمون تین شماروں میں لگاتار شائع ہوا ہے۔ "کتاب نما" کے چند مضمون نما اداریے حسب ذیل ہیں :

نیا ادبی منظرنامہ : اثبات و نفی کی کشمکش / ابوالکلام قاسمی /	اگست ۱۹۸۸ء
مجھے رکن لوگوں سے چڑھ ہے / شمس الرحمٰن فاروقی /	ستمبر "
عصری ادب کا ثقافتی ڈھانچہ / فضیل جعفری	نومبر "
عوامی ادب کے مسائل اور اردو کی ادبی روایت / شمیم حنفی	جنوری ۱۹۸۹ء
افسانہ نگاری اور قاری / وارث علوی	فروری "
بلاعنوان / عبدالمغنی /	مئی "

گو کہ مہمان مدیران کی یہ تحریریں اداریے نہیں مضامین ہیں جنھیں اداریے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے لہٰذا ہم نے ان کو اسی زمرے میں رکھا ہے۔ ان مضامین میں بعض باتیں ایسی ہیں جو ہمارے آپ کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہیں مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ ارشاد :

"مجھے ایسے لوگوں سے ہمیشہ چڑھ رہی ہے کہ جو لوگ اردو نوازاور اردو دوست ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ اردو کو کوئی کیا نواز سکتا ہے۔ ارے اردو تو خود ان کو نوازتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی کہ اگر ہم صحیح اردو لکھ سکیں ورنہ اچھی زبان لکھنے والے کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے۔" (ستمبر ۱۹۸۸ء)

ان اداریوں میں بعض بالکل نئی بحثیں بھی چھیڑی گئی ہیں جو کہ واقعی اردو کے قارئین اور خاص طور پر محققین و ناقدین کے لئے غور و فکر اور تلاش و تحقیق کی نئی راہیں کھولتی ہیں۔ شمیم حنفی کا اداریہ "عوامی ادب کے مسائل اور اردو کی ادبی روایت" ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان اداریوں کی روشنی میں یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ "کتاب نما" نے مہمان مدیر کا سلسلہ شروع کر کے اپنے اداریوں کی شکل میں اردو ادب و تنقید کو گراں قدر سرمایہ عطا کیا ہے۔

"ایوان اردو"

دہلی اردو اکیڈمی کی جانب سے شائع ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے اس کی پالیسی میں سرکاری پروپیگنڈے کی شمولیت لازمی ہے۔ حکومت کے ہر اقدام کی تعریف برسراقتدار جماعت کے سرکردہ لیڈروں کی مدح سرائی، ملک کے سیاسی نظام کے قصیدے وغیرہ جیسے عناصر تو اس رسالے کے اداریوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عصری حالات و واقعات اور اردو سے متعلق مسائل پر بھی اکثر اداریوں میں اظہار خیال کیا گیا ہے اور بعض مفید بحثیں اس ضمن میں زیر قلم آگئی ہیں۔ چند نمونے پیش ہیں :

مئی ۱۹۸۷ : "حرف آغاز کے عنوان سے لکھے گئے اس اداریے میں بتایا گیا ہے کہ دہلی اردو صحافت کا قدیم مرکز ہے اور یہاں سے بہت سے اچھے اردو اخبارات و رسائل نکل

رہے ہیں۔ ایوان اردو ان میں سے ایک ہے۔ ایوان اردو کی پالیسی بیان کرتے ہوئے مدیر لکھتا ہے کہ اس رسالے کا مقصد اردو زبان و ادب اور اپنی گنگا جمنا تہذیب کو فروغ دینا ہے۔ مدیر کے مطابق ایوان اردو کا ایک اور مقصد سائنسی روشن خیالی کو فروغ دینا ہے جسے اول الذکر مقصد کا تابع بھی کہا جاسکتا ہے۔ اگر ہم عقل و استدلال کی روشنی میں دوسروں کے نقطہ نظر کو بھی دیکھیں تو ہم انھیں بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور ان بدگمانیوں سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں جو ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔

جون ۱۹۸۷ء :

اس اداریے میں آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کی صورت حال پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مدیر نے حکومت کی جانب سے اردو کی فلاح کے لئے اٹھائے گئے اقدامات کا تشکرانہ ذکر کیا ہے۔

اگست ۱۹۸۷ء : اردو والوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھا کریں۔ کاروبار کا حساب اردو میں کریں اور اردو کے یوم اور ہفتے منائیں۔

بقیہ اداریوں میں جن میں بعض مخمور سعیدی کے لکھے ہوئے ہیں 'اردو تعلیم پر زور' اردو تنظیموں کو ایمانداری سے کام کرنے کا مشورہ' صدر جمہوریہ کی اردو سے متعلق تقاریر کا ذکر' ادیبوں اور شاعروں کی وفات کی خبریں' اردو ہندی کے رشتے' اردو کے تئیں تعصب اور ہندی دانشوروں کا معاندانہ رویہ کانگریس نیتاؤں کی "اردو دوستی" کی تعریف' بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے پر اظہارِ مسرت اور حکومت کو مبارک باد' بہار میں اردو کے غیر معیاری اور غلط استعمال پر تشویش' اکادمی پر الزامات کی تردید' خاص نمبروں کا اعلان اور تعارف' قارئین کے حوصلہ افزا ردعمل کا ذکر وغیرہ چیزیں شامل ہیں۔

مذکورہ بالا جائزے کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ دہلی میں اردو کے رسائل نے ادبی اداریہ نویسی کو بتدریج ارتقا کی منزلوں سے ہمکنار کیا ہے اور اخباری اداریوں کے ساتھ اردو میں ادبی اداریہ نویسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ روایت اپنی پوری توانائی کے ساتھ جاری ہے اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس روایت میں بھی اچھے بُرے دونوں طرح کے اضافے ہو رہے ہیں۔

باب چہارم

ادبی رسائل میں شعری اصناف اور ان کا تنقیدی جائزہ

موضوع، ہیئت، اسلوب بیان

اردو زبان اپنی تشکیل کے آغاز سے مسلسل ارتقا کی منزلوں کی طرف گامزن رہی ہے۔ اصلاح زبان کی مختلف تحریکوں کے نتیجے میں ایک طرف اس کو صاف، شستہ اور فصیح بنانے کی کوششیں مسلسل جاری رہیں تو دوسری طرف ملکی و غیر ملکی ادبیات کے مطالعے اور ان سے استفادے کے ذریعے (خاص طور پر عربی اور فارسی ادب) اردو ادب میں موضوعاتی اور صنفی و ہیتی سطح پر اضافہ کرتے رہے۔ ان کوششوں کی ایک شکل وہ بھی تھی جب حالی اور ان کے ہمنواؤں نے موضوعاتی و ہیتی سطح پر غزل اور نظم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ وہ دور تھا جہاں سے اردو ادب میں افادیت کا پہلو شامل ہوا یعنی اردو ادب کو سماج کی اصلاح کا آلہ بھی بنایا جانے لگا۔ آزادی سے قبل بیسویں صدی کے افادیت پسند قلم کاروں میں نذیر احمد، راشد الخیری، محمد حسین آزاد، سرسید اور پریم چند وغیرہ اہم ہیں۔ رومانوی تحریک کے خاتمے سے ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اور اس کے زیر اثر ادب کی افادیت کی بھرپور تبلیغ کی گئی اگرچہ اس تحریک اور حالی کی اصلاحی تحریک سے بھی قبل سماجی حقیقت نگاری کے نمونے اردو شعر و ادب میں مل جاتے ہیں لیکن ترقی پسند تحریک نے اس کو ایک نظریے کے طور پر رائج کیا اور برتا جس کے نتیجے میں ایک غیر متوازن کیفیت ادب میں پیدا ہوگئی اور ہمارے قلم کاروں کو موضوعاتی یکسانیت اور اسلوب کے سطحی اور عوامی پن کا شکوہ ہونے لگا۔ لہٰذا علامت و تجریدیت پسندی نے بہت جلد جدیدیت کی شکل میں اپنا سکہ جمالیا۔ دہلی سے جاری ہونے والے ادبی رسائل ان تمام ادبی رویوں کی نمائندگی کا پتہ دیتے ہیں جس کا تفصیلی جائزہ اس باب میں پیش کیا جائے گا۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات کے المیے نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو بے انتہا متاثر کیا اور فطری طور پر ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ بہت سے شعراء نے مثلاً ساغر نظامی، جگر مراد آبادی، روش صدیقی، اقبال سہیل، جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، اختر الایمان، وامق جونپوری، ساحر لدھیانوی، شاد عارفی، بلراج کومل وغیرہ باوجودیکہ مختلف الخیال تھے اور جدا جدا نظریوں کے حامی تھے لیکن اس صورت حال کا رد عمل ان سب پر یکساں طور پر مرتب ہوا تھا اور یہی سبب ہے کہ اس نکتے پر پہنچ کر سب کے سب ہم آواز نظر آتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خوابوں کے رنگ ہوا میں بکھر کر تحلیل ہو گئے تھے اور اب ہر سمت ایک دھند سی چھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ان کیفیات کی عکاسی ہمیں آزادی کے بعد کے رسائل میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

فسادات کے المیے کی قربتیں حساس دلوں کو تڑپا رہی تھیں لیکن بہر حال لاکھوں جانوں کا نذرانہ دے کر مغربی سامراج سے آزادی حاصل کی گئی تھی، لہٰذا کفران نعمت بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے ہمارے شعراء نے آزادی کی خوشی کا بھی اظہار کیا اور اپنی شجاعت و کامرانی کے ترانے گائے۔

تقریباً نوے سال کی جدوجہد اور بے شمار انسانی جانوں کی قربانیوں سے جو نعمت آزادی حاصل ہوئی تھی اس کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ملک کا ہر باشندہ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو اور اپنے وطن عزیز کی قدر و قیمت پہچانے۔ اس جذبہ محبت کو ابھارنے کے لیے اردو رسائل نے خاطر خواہ کوششیں کیں خاص طور پر ''آج کل'' میں اس طرف زیادہ دھیان دیا گیا۔

جدوجہد آزادی کی پرچھائیاں بھی ہماری شاعری میں بہت گہری نظر آتی ہیں اور اردو رسائل نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ناقابل فراموش حصہ لیا تھا۔

اردو شاعری میں ایک دور وہ بھی آیا جب آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ یہ مبارک ساعتیں وہ تھیں جب مدتوں سے مرجھائی ہوئی آنکھوں میں ایک تازگی پیدا ہو گئی اور مایوسیوں نے اپنا سامان سفر باندھا۔ امیدوں کے قافلے پڑاؤ ڈالنے لگے، مستقبل میں دور تک روشنی دکھائی دینے لگی لیکن اچانک خواب چکنا چور ہو گئے۔ وہ جنھوں نے غیروں کے خلاف اہنسا کا روّیہ اپنایا تھا، بھائیوں کے اوپر ہنسا کا وار کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھنے لگے، جن

پڑوسیوں نے ہر دکھ درد اور ہر خوشی کے موقع پر ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا اور برادرانہ محبتوں کے خزانے لٹائے تھے، آپس میں ایسے دشمن ہو گئے گویا ازلی بیر رکھتے ہوں۔ سرحدوں پر وہ خون ریزی ہوئی کہ زمین لالہ زار بن گئی۔ ایسے میں ہمارے شاعروں کے دلوں پر جو بیتی ہو گی اس کا اندازہ آزادی کے بعد کے ان ادبی رسائل کی تخلیقات سے بخوبی ہوتا ہے۔ خاص طور پر "آج کل" اور "شاہراہ" میں ان کیفیات کی عکاسی نمایاں ہے۔

فسادات کے بعد مہاجرت کا المیہ ظہور پذیر ہوا جس کے نتیجے میں برصغیر ایک نئے مسئلے سے دوچار ہوا۔ اس المیے کا اثر انسانی نفسیات پر انتہائی شدید ہوا جن کو اس مسئلے سے سابقہ پڑا اور جو اس بدقسمتی کا شکار ہوئے، ان کی نفسی کیفیت کا مطالعہ اردو رسائل میں شائع شدہ ان کی تخلیقات کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں اس کا اظہار ہندوستانی رسائل کی بہ نسبت زیادہ ملتا ہے۔ تاہم دہلی کے ادبی رسائل میں اس موضوع پر خاصا مواد مل جاتا ہے "شاہراہ" "عصری آگہی" اس کا ثبوت ہیں۔

موضوعات کے حوالے سے اگر ہم دہلی کے تمام ادبی رسائل میں شائع شدہ شعری اصناف کا مطالعہ کریں تو نتیجہ ظاہر ہے یعنی گردش شب روز کے ساتھ جو تبدیلیاں انسانی سماج اور نفسیات کی سطح پر رونما ہوئیں، وہ ہماری شاعری کا محرک بنیں لیکن جدیدیت کے زیر اثر موضوع کی اہمیت ثانوی ہو جانے پر پیرایہ اظہار کے جوہر دکھائے جانے کا رجحان عام ہوا تو شاعری کے حوالے سے موضوعات کی تلاش کی اہمیت کم ہو جاتی ہے البتہ فیشن کے طور صنعتی تہذیب کے منفی اثرات یعنی تنہائی، خوف، تشکک، اقتدار کی شکست و ریخت جیسے موضوعات عام طور پر برتے گئے۔ آئندہ صفحات میں دہلی سے جاری ہونے والے اردو کے ان ادبی رسائل کی شعری نگارشات کے منتخب نمونے پیش کیے جاتے ہیں جو آزادی کے بعد شائع ہوئے تاکہ موضوع، ہیئت اور اسلوب کی سطح پر ان رسائل کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ آج کل

اس جریدے میں ہم عصر مشاہیر شعراء کی تخلیقات ہمیشہ شائع ہوتی رہیں جن سے اس کا اسلوب وضع ہوتا ہے۔ ان تخلیقات میں ہیئت کے تجربات کافی کیے گئے ہیں مثلاً پریمی رام پوری کی نظم "ایک پھانس" جو کہ بیک وقت قطعہ بند مسمط اور مثنوی دونوں ہیئتوں کی حامل

ہے۔

ہیں مسلط ابھی ذہنوں پہ وہی رسم و رواج
ہوتی ہے فعل سے ہر قول کی تردید ابھی
ہیں اسی طرح ارادے ابھی پابند سماج
ان کو حاصل نہیں جذبات کی تائید ابھی
سوچتا ہوں کہ بدل دوں یہ روایات کہیں
توڑ دوں خام خیالی کی سنہری زنجیر
ڈھال دوں ایک نئے سانچے میں زمانے کا چلن
سینۂ خواب سے پیدا ہو شعاعِ تعبیر

(آج کل دسمبر ۴۷ء)

"آج کل کی مشمولہ شعری نگارشات بلاشبہ نمائندہ شعری رجحانات کا پتہ دیتی ہیں۔ ہر فکرو خیال کے فن کاروں کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ایک طرف روایتی انداز بیان کی کارفرمائی ہے تو دوسری طرف بے حد جدید فضا بھی اس میں پائی جاتی ہے۔ بعض تخلیقات اصلاحی بھی ہوتی ہیں اور بعض عصری حسیت کی ترجمان بھی۔ ذیل میں ہر قسم کے نمونے پیش ہیں :

ابر احسنی گنوری (غزل)

حاصل وہ عشق زیست کا عرفاں نہ کر سکے
جو دل کو ساز غم پہ غزل خواں نہ کر سکے

(شمارہ فروری ۱۹۵۰)

ہری چند اختر (غزل)

فکر دنیا ہے مجھے، خواہش عقبیٰ ہے مجھے
عیش کی دھن ہے مجھے موت کا دھڑکا ہے مجھے

(جون ۱۹۴۹ء)

روش صدیقی (غزل)

آتش فتنہ افلاک کہیں تک پہنچے
تاب کیا ہے جو کسی خاک نشیں تک پہنچے

(نمبر ۱۹۵۱ء)

ان غزلوں کا اسلوب روایتی مگر دلکش ہے۔ عشق مجازی و حقیقی جو کہ روایتی تغزل کا خاص موضوع تھا، ان غزلوں میں نظر آتا ہے۔ لہجے کا بے ساختہ پن کہیں کہیں شعر میں بے پناہ حسن پیدا کر دیتا ہے سو اس کی مثالیں آج کل میں بہت ہیں۔

صغیر احمد صوفی

کیوں سعی غم انجام میں دن رات گزارو
اب جام اٹھاؤ غم ایام کے مارو

(ستمبر ۱۹۵۴ء)

بسمل سعیدی

بن کر نشاط روحِ محزوں پہ چھا رہا ہے
روح طرب کی صورت غم میں سما رہا ہے

(ستمبر ۱۹۵۴ء)

جوش ملیح آبادی (نظم)

بتوں کے خیمۂ زرتار کی خموشی کو
صدائے بربط و چنگ و ستار دی ہم نے

(اگست ۱۹۵۴ء)

سحر رام پوری "عزمِ صادق" (نظم مثلث)

مٹیں گے ہم نہ کبھی تجھ سے گردشِ ایام
رہیں گے ہم نہ کبھی تجھ سے یورش آلام
ہر ایک چیز فنا ہو مگر ہمارا نام؟

(اگست ۱۹۵۴ء)

آج کل میں کہیں کہیں منظر نگاری کے بھی خوبصورت نمونے مل جاتے ہیں۔ مثلاً دینا ناتھ مست کی کی نظم "کشمیر کی کنول جھیل" (ستمبر ۱۹۵۱ء) جو کہ روایتی اسلوب کی حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر دلکش مناظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

موجزن ہے نیلگوں تالاب ڈل چاروں طرف
عکس افگن اس میں عرفانی جبل چاروں طرف
سبز پانی میں شگفتہ ہیں کنول چاروں طرف
چھائی ہے کیا رونق باغ ازل چاروں طرف

آزادی کے بعد اردو کے شعری اسالیب نے کئی تبدیلیاں دیکھیں جن میں جدیدیت کا رنگ نسبتاً زیادہ نمایاں ہو کر اثرانداز ہوا لیکن اس کے ساتھ زبان کے جوہر دکھائے جانے کا کلاسیکی انداز بھی بعض شاعروں نے اپنایا۔ جدیدیت اور زبان کے شعروں کی مثالیں دیکھئے جو ''آج کل'' کے اسلوب کا ایک حصہ ہیں :

دوسری باتوں میں ہم کو ہو گیا گھاٹا بہت
ورنہ فکر شعر کو دو وقت کا آٹا بہت (شجاع خاور۔ جنوری ۱۹۸۴)

ابھرتے ڈوبتے لمحے تمام حیرت کے
میں خواب دیکھتا رہتا ہوں اپنی ہجرت کے (افتخار امام۔ جنوری ۱۹۸۴)

نظم آزاد

یہ راستہ تم نے خود چنا تھا/ تمھیں نے اس کو نشاط گاہ سفر کہا تھا/ یہ بھیڑیے یہ مہیب اجگر/ لہو لہو جو پکارتے ہیں/ تمھارے قدموں کی چاپ سنکر.....

(اندر سروپ دت ناداں۔ جولائی ۸۴ء ص ۲۱)

غزل

اُداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا
ہزاروں جگنوؤں سے بھی اندھیرا کم نہیں ہوتا
بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی
اسے بھی غم نہیں ہوتا، مجھے بھی غم نہیں ہوتا

(بشیر بدر ستمبر ۱۹۸۴ء ص ۲۷)

ہر گھڑی خود سے الجھنا ہے مقدر میرا
میں ہی کشتی ہوں مجھی میں ہے سمندر میرا

(ندا فاضلی نومبر ۱۹۸۴ء ص ۲۴)

"آج کل" کی ان تخلیقات میں جہاں زبان و بیان کی سطح پر ایک نیا پن اور دلکشی نظر آتی ہے وہیں اسلوب کے پس منظر میں شاعر کی نفسی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نفسی کیفیت عبارت ہے اپنے ماحول کی ٹوٹتی ہوئی زنجیروں سے' صدیوں کی روایات اور اقدار جب صنعتی تہذیب کے ایک وار میں ریزہ ریزہ ہو جائیں تو اسی طرح کا انداز بیان اور لہجہ جنم لیتا ہے۔ رشتوں میں نہ تقدس رہا اور نہ استحکام۔ سارا انسانی سماج تجارتی مفادات کی بنیادوں پر کھڑا عذاب کی صورت زندگی کو اپنی ہر آنے والی نسل پر پھینک رہا ہو تو ایک شاعر اپنی حساس طبیعت میں ایک جھنجھلاہٹ' مایوسی اور بے یقینی کی فضا پاتا ہے۔ جدید شاعری میں یہ رجحان گذشتہ دہائیوں میں بہت زیادہ مقبول رہا۔ اگرچہ مغربی تہذیب نے اس صورت حال کو جس شدت سے جھیلا ہے' اس کا بہت کم عنصر ہمارے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے یہاں صنعتی تہذیب صرف میٹروپولٹن شہروں ہی میں رائج ہے اور اگر تجربے کی بنیاد پر تنہائی والی شاعری کی جاتی تو انہی شہروں کے قلمکاروں کو اس کا حق پہنچتا تھا لیکن یہاں صورت حال یہ رہی ہے کہ کچھ موضوعات کو بعینہٖ مغرب سے مستعار لے کر اپنی شعری تخلیقات میں استعمال کیا جانے لگا۔ حالاں کہ جدیدیت نے موضوعات کی کوئی قید نہیں لگائی تھی لیکن بھیڑ چال کو کیا کہا جائے۔ یہی حال اسلوب کا ہوا۔ استعاراتی و علامتی پیرایہ اظہار کو جب مقبولیت حاصل ہوئی تو وہ شعراء بھی اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے جن کو اس اسلوب پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہمل گوئی جدیدیت کی شناخت بن گئی۔ حالاں کہ علامت نگاری اسلوب میں حسن پیدا کرتی ہے لیکن یہ سب کے بس کا روگ نہیں۔ پھر جدیدیت کی مخالفت کرنے والے نقادوں نے انہی ناپختہ کاروں کی تخلیقات کو اپنی تحریروں میں حوالے کے طور پر استعمال کیا اور جدیدیت کو اس طرح پیش کیا کہ لوگ اس کے نام سے چڑنے لگے۔ لیکن جو قادر الکلام شاعر تھے انھوں نے اس صورت حال کو سمجھ لیا اور اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کو اہمال کے الزام سے بچائے رکھا اور عوام میں مقبول ہوئے۔ یہ الگ بات کہ جدیدیت پسند شاعری عوام کے زیادہ بڑے طبقے کو متاثر اس لیے نہ کر سکی کہ ان کا مزاج ترقی پسندوں نے سہل پسند بنا دیا تھا۔ لہٰذا لوگ اسی شاعری کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو فوراً سمجھ میں آجائے اور جس کی وضاحت کی ضرورت نہ پڑے۔ سہل ممتنع میں شاعری تو جدیدیت پسندوں نے بھی کی ہے لیکن اکثر اشعار میں ایک ہلکا سا ابہام بھی روا رکھا ہے تاکہ معنوی سطح پر گہرائی

اور تہہ داری شعر میں پیدا ہو سکے۔ لہٰذا یہ اسلوب ہر کس و ناکس کے لیے قابل فہم نہ ہو کر مخصوص طبقے کے ذوق کی تسکین کا سامان قرار پایا۔ بہرحال یہ تمام رنگ آج بھی "آج کل" کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں :

غزل :

نہ دے بشارت گلزار و فصل آئندہ
مرے گئے ہوئے موسم کی واپسی کردے
بگاڑ پائے گا تو کیا زیاں پرستوں کا
اداس قبروں پہ کتنی بھی چاندنی کردے

(مصور سبزواری، مارچ ۱۹۹۴، ص ۳۶)

آزاد نظم

کون تھا جس کی تحریک پر / رنیلگوں آسماں کی بلندی کو چھونے کی خواہش مرے دل میں پیدا ہوئی / اور / شہپر مرے / ایک مدت سے جو صرف چھوٹی اڑانوں سے مانوس تھے / بال جبریل سے مس ہوئے / ......

("شکست پرواز" شکیل جہانگیری۔ نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۶۲)

پھینکتے سنگ صدا ٹھہرے ہوئے پانی میں ہم
اور خود کو دیکھتے کچھ دیر طغیانی میں ہم

(احمد محفوظ۔ فروری ۱۹۹۵، ص ۲۹)

یونہی نہیں کشش بے پناہ رکھتا ہے
جلو میں اپنے کئی مہر و ماہ رکھتا ہے

(سراج اجمل۔ فروری ۱۹۹۵ء ص ۲۹)

خاموشی ہوتی ذرا سی کبھی گہری تو صدا ہوجائے
کس نے کاٹے ہیں وہ سب ہاتھ کہ جو نغمہ سرا ہوجائے

(حکیم منظور۔ جنوری ۱۹۸۴ء ص ۲۷)

منظر سیاہ پوش نہ پیکر جلا ہوا
ہر شخص اپنی ذات کے اندر جلا ہوا

(فضا ابن فیضی۔ جولائی ۱۹۸۴ء ص ۲۲)

ان غزلوں میں عشق کے ذاتی تجربوں اور قلبی وارداتوں کے علاوہ عصری حسیت کا پتہ بھی ملتا ہے۔ عالمی سیاست کا بدلتا ہوا رخ آج کے شاعر سے پوشیدہ نہیں۔ امریکی سامراج نے جس طرح تمام دنیا کو اپنے سیاسی شکنجے میں جکڑ رکھا ہے اس کا اظہار ''آج کل'' کے مشمولات میں ہوا ہے۔ سماج کی بدلتی ہوئی قدروں اور انسان کی خود غرضی سے مجروح انسان کے دل کی جراحتیں بھی ''آج کل'' کی شاعری میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ناموافق حالات کو بدلنے اور انھیں ہم آہنگ کرنے کے لئے جدوجہد کا جوش بھی ان میں ملتا ہے۔

''آج کل'' میں زیادہ تر غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی رباعیات و قطعات وغیرہ بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ اس جریدے کا معیار ابتداء ہی سے بلند رہا ہے۔ ہر دور کے بڑے قلمکاروں کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی اس ادارے نے دل کھول کر کی ہے۔ ''آج کل'' میں شائع ہونے والی شعری تخلیقات اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کی شعری نگارشات کا اسلوب قدیم و جدید کا بہترین امتزاج ہے۔ جدیدیت سے متاثر پیرایہ بیان میں البتہ ایک انوکھا پن نظر آتا ہے جس میں نامانوس استعاروں، علامتوں اور زبان کی سطح پر تجربہ پسندی کا رجحان ملتا ہے۔ کلاسیکی پیرایہ بیان بھی ''آج کل'' کی تخلیقات کا خاصہ ہے۔ اس کا اپنا لطف ہے اور آج بھی اتنا ہی مقبول جتنا کہ سو سال پہلے تھا۔

۲۔ ''شاہراہ''

جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر کیا گیا ''شاہراہ'' نے ادب کے افادی پہلو کو نمایاں کر کے اس کے ذریعے مارکسی نظریے پر مبنی سماج کی تعمیر و ترقی پر زور دیا۔ ''شاہراہ'' کا یہ نظریاتی پہلو اپنی جگہ لیکن اس نے ہیئت کی سطح پر اردو شاعری کو تنوع بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عوامی ادب سے استفادے کی روایت ترقی پسندی ہی نے شروع کی تھی۔ لہٰذا ''شاہراہ'' میں ایسی نگارشات کی کمی نہیں جن کا اسلوب لوک گیتوں سے بہت قریب ہے۔ غزل، پابند نظم، نظم

معریٰ، نظم آزاد، ہائیکو، دوہا، گیت، قطعات و رباعیات، سانیٹ، ترائیلے غرض ہیئت کے اعتبار سے "شاہراہ" میں کافی رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ ہم عصر مشاہیر کی تخلیقات اس رسالے کی زینت بنتی رہیں اور اردو کے افادی ادب میں گراں بہا اضافہ کرتی رہیں۔ ذیل میں ہم مختلف شعری اصناف کے نمونے پیش کرتے ہیں :

نظم پابند

لڑھکتا ہوا سُست رفتار سورج
پہاڑوں کی نیلی مسہری میں آکر
کئی بار سویا کئی بار جاگا
محیط جہاں پر سسکتا اندھیرا
کئی بار چھایا شفق کے سہارے....؟

("تسلسل" وشوامتر عادل، شمارہ ۱ جلد ۳)

دلوں پہ تازہ غلامی کے زخم کھائے ہوئے
چراغ راہ ہر اک زخم کو بنائے ہوئے
لہو میں حسرت و ارمان کے نہائے ہوئے
جبیں کو سرخ تبسم سے جگمگائے ہوئے.... الخ نیاز حیدر "شان نزول" " ص ۱۰۶

غزل

کہاں تصور پستی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لاتے نہیں زمینوں کو

جوش جلد ۱ شمارہ ۱

رات کا گہرا سناٹا ہو یا دن کا کہرام
روٹی روٹی چلاتے ہیں خالی پیٹ عوام
فاقے دے کر جنگ میں جھونکے یہ تیرا بیوپار
کولمبس کے دیس کے راجا تیری جے جے کار

("قصیدہ" قتیل شفائی جلد ۱ شمارہ ۲ ص ۱۲)

آپ ہیں امن و عافیت اندیش
ڈھالتے ہیں جبھی تو ایٹم بم
مدنیت کا ادعا ہے مگر
کھا رہے ہیں تباہیوں کی قسم

("ایٹم بم" شاد عارفی جولائی ۱۹۵۰ء ص ۴۷)

ہم دنیا کو چلانے والے
اور ہمیں پامال یہ کیا ہے
ہم دنیا کو بچانے والے
اور اتنے بدحال یہ کیا ہے ....

("مزدور سرمایہ دار۔ انقلاب" فراق اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۴۱)

عوامی لہجے میں کہی گئی نظموں کی مثالیں خاصی تعداد میں "شاہراہ" میں ملتی ہیں۔ خالص ادبی زبان کے نمونے بھی جگہ جگہ مل جاتے ہیں جن میں زبان کا حسن بھی ہے اور طرز ادا کی جدت بھی ہیئت کے تجربے بھی ہیں اور معنوی خوبیاں بھی۔ چند مثالیں دیکھیے :

یہ دوڑ دھوپ یہ ہلچل یہ کاوشیں کیا ہیں
فضائے عالم ہستی میں بے کلی کیوں ہے
ہر ایک ذرے میں انداز برہمی کیوں ہے
سکوں محال ہے کیوں کاروبار فطرت میں
ہر ایک ذرے میں انداز برہمی کیوں ہے
نگاہ عقل نے بدلے ہیں زاویے کیا کیا
دکھائے مشعل عرفاں نے راستے کیا کیا
کیے ہیں شوق نے طے غم کے مرحلے کیا کیا...

("تگ و دو" داؤد غازی۔ مئی ۱۹۵۸ء ص ۷۷)

کس ستم گر نے ہر بزم یہ قصہ چھیڑا
نشہ حسن میں سرشار حسیں راہوں پر

زلف کھولے ہوئے پھرتے تھے حسینان جہاں
رنگ تھا نور تھا رعنائی تھی تاحد نظر...

("خاکہ گل" کرشن ادیب۔ اپریل ۱۹۵۸ء ص ۲۷)

وادی عرش میں چراغ نجوم
جگمگاتے ہیں لو بڑھائے ہوئے
جادۂ کہکشاں یہ شب کے سفیر
دم بخود ہیں نظر جھکائے ہوئے
جانے کس خواب میں ہے صبح بہار
یوں گزرتے ہیں یہ گراں لمحات
جیسے بیمار پڑ گئی ہو رات

("کون ہے" شرر فتح پوری۔ سالنامہ جنوری ۱۹۵۶ء ص ۳۹)

"شاہراہ" میں نظم معری کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً نیند کیوں نہیں آتی" (مظہر امام۔ دسمبر ۱۹۵۴ء ص ۳۹) "شب تاب" (گوپال مثل جلد اشمارہ اص ۸۱) وغیرہ۔

آزاد نظم میں "ہمالہ کی گہرائی میں نہ جاؤ" (سلام مچھلی شہری ج ا ش ا ص ۸۶) "یہ زرد بچے (بلراج کومل سالنامہ ۱۹۵۶ء ص ۵۴) "کاغذی پیرہن" (خلیل الرحمٰن اعظمی، سالنامہ ۵۶ء ص ۶۵) "اودھ کی خاک حسیں" (علی سردار جعفری فروری، مارچ ۱۹۵۱ء ص ۴۱)، صداقت کی کرنو" (تاجور سامری۔ اپریل ۱۹۵۰ء ص ۶۵) دلکش اسلوب کی ترجمان ہیں۔ ان کے علاوہ باقی، پریم وار برٹنی، رفعت سروش، شاذ تمکنت، مراجی وغیرہ کی آزاد نظمیں بھی "شاہرا" میں چھپی ہیں جن کو زبان و بیان کی دلکشی کے اعتبار سے بہترین تخلیقات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

رباعیات و قطعات

داستان مال گل کہہ کر
مصلحت کیا اسے ڈرائے گی
مسکرانا کلی کی عادت ہے
خون ہوکر بھی مسکرائے گی

(نریش کمار شاد۔ جلد اشمارہ ۱)

یہ شعر و ادب برحق، لیکن مجھے بتلاؤ !
کیسی ہیں یہ کاندھوں پہ کفنائی ہوئی لاشیں
میں رمز ثقافت سے آگاہ نہیں لیکن
یہ کھود رہے ہیں کیوں دفنائی ہوئی لاشیں

(اختر انصاری۔ فروری ۱۹۵۰ء ص ۱۰۲)

دباؤ حرید میں شرارے نہ لپیٹ
بہتے ہوئے پانی میں ستارے نہ لپیٹ
گرتے ہوئے انسان کی زبوں حالی میں
الجھے ہوئے انساں کے شرار نہ لپیٹ

(احمد ندیم قاسمی شمارہ ۶ ۱۹۵۰ء ص ۱۱۴)

قطعات :

تصور میں یوں رمساتی ہے اکثر
تری نرم نظروں کی یہ مسکراہٹ
ہو بارش سے پہلے فضاؤں میں جیسے
بہت دھیمی دھیمی سی اک سنسناہٹ

(میش چندر نقش۔ جون ۱۹۵۷ء ص ۵۸)

کب کی رخصت ہوئی چمن سے خزاں
اب تو باد صبا ملول نہیں
کیا کریں اس بہار کو لیکن
ان کی زلفوں میں کوئی پھول نہیں

(پریم وار برٹنی۔ نومبر ۱۹۵۷ء ص ۵)

گیت

تم اور دیس ہم اور دیس -- صحرا پربت
کہو کیسے ملیں -- کیا جتن کریں
ہم دونوں انجان رہے

تم اور دیس ہم اور دیس ----- الخ

(میراجی- جلد اشمارہ اص ۸۰)

بول رے ساتھی بول
راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول
کب تک یوں ہی بیٹھے رہنا بول رے ساتھی بول...

(اختر ہوشیار پوری جلد اشمارہ ۲)

بیت گئی سکھ بیلا
دور کہیں شہنائی باجی کوئی ہوا اکیلا
بیت گئی سکھ بیلا.... الخ

(اکرام نگار جلد اشمارہ ۶)

رات سہانی مدھر سنہری
آسمان پر کنچن
دیکھا کی ہیں ہلکی گہری
رات سہانی مدھر سنہری... الخ

(افسر آزری- جلد اشمارہ ۶)

نین جھروکے رَس دن بین کریں

(قتیل شفائی ج اش ۶)

غزل

جگر اور دل کو بچانا بھی ہے
نظر آپ ہی سے ملانا بھی ہے۔

(مجاز ج اش ا)

مجسم حقیقت سراپا فسانہ
محبت کا عالم جنوں کا زمانہ

(جگر ۲ر۲)

نگہ ناز سے وہ نغمہ سنا آج مجھے
نہ رہے شورش عالم کا پتہ آج مجھے

(فراقؔ ۲؍۲)

معشوق گر رہے ہیں جوانی کے جوش سے
چشمے ابل رہے ہیں روانی کے جوش سے

(عدمؔ ۲؍۲)

چہرہ جو گلستاں ہے، صہبا کے سوا اس میں، کچھ اور بھی شامل ہے
اللہ رے فروغ اس کا، خون دل بسمل ہی، رنگ رخ قاتل ہے

(حبیب تنویر ۲؍۲)

مری نگاہوں میں باغباں تیز خار بن کر کھٹک رہے ہیں
کہ دن کے سائے میں پھول خوں کے ایاغ بن کر چھلک رہے ہیں

(عارف عبدالمتین ۲؍۳-۴)

آئی نہ پھر نظر کہیں جانے کدھر گئی
ان تک تو ساتھ گردش شام و سحر گئی

(باقیؔ صدیقی ۲؍۶)

کوئی طلب نہ تمنا کوئی خیال نہ خواب
گزار آئے ہیں دیوانے وہ بھی دور شباب

(اخترؔ ہوشیارپوری ۲؍۶)

عشق بانہیں مروڑنے میں ہے
شاعری پھول توڑنے میں ہے

(شادؔ عارفی ۲؍۷)

خوب ہمارا ساتھ نبھایا بیچ بھنور میں چھوڑا ساتھ
ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جاپہنچے ہو اچھی بات

(ابنؔ انشا ۲؍۱۲)

دامن ساحل سے ناواقف نظر پیدا کریں
ہے تقاضائے جنوں طوفاں میں گھر پیدا کریں

(حبیب جالب ۲ر۴)

تمہاری بات ہے مسلک نظر ہے خوں آشام
رموز جور سے آگاہ ہو چکے ہیں عوام

(مظہر امام ۵ر۲)

آپ سے ہو کے ہمکنار اک پل
دل کو ملتا نہیں قرار اک پل

(محمد علوی ۵ر۳)

اس کے علاوہ حسن نعیم، ساغر نظامی، من موہن تلخ، عمیق حنفی، بانی، بشر نواز، مصور سبزواری، اسلم پرویز، بشیر بدر، وشوناتھ درد، ساحر ہوشیار پوری، خالد ندیم، روش صدیقی، منیب الرحمن، سلیمان اریب، محشر بدایونی، وامق جونپوری، فارغ بخاری، وغیرہ کی غزلیں بھی جریدے میں شامل ہیں۔

"شاہراہ" کی غزلوں کا اسلوب کئی طرح کا ہے۔ بعض رجائی لہجے کی حامل ہیں اور خارجی معاملات کو زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔ ان غزلوں میں افادیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن زیادہ تر غزلیں عشقیہ واردات سے مملو ہیں اور تغزل کی فضا کو برقرار رکھتی ہیں۔ اکثر غزلوں میں بحر اور زبان کے تجربے بھی ملتے ہیں۔

رباعیات وقطعات میں بھی دلکشی ہے لیکن ان کو اعلیٰ درجے کا نہیں کہا جا سکتا۔ گیتوں میں البتہ بعض بیحد خوبصورت اور پراثر ہیں جن میں بھوج پوری اور برج بھاشا کے استعمال نے غضب کی موسیقی اور سوز و گداز پیدا کر دیا ہے۔

نظمیں اکثر فنی ضابطوں کے مطابق اور ادبیت لئے ہوئے ہیں جن میں افادیت کے باوجود جمالیاتی حسن موجود ہے۔ البتہ بعض نظمیں صرف عوام کے لئے لکھی گئی ہیں جن کو وہ اشتراکیت کی تبلیغ کے لئے گلی کوچوں میں گا سکیں۔ ایسی نظموں میں ادبیت کم ہے۔

مجموعی طور پر "شاہراہ" میں شامل شعری اصناف شاعری کے اس مزاج کی علمبردار ہیں جس کی ابتدا حالی اور محمد حسین آزاد کے ہاتھوں ہوئی اور اقبالؔ، چکبستؔ، حسرتؔ موہانی وغیرہ

نے جسے اپنا کر قبول عام کی سند دلوائی۔ ان شعری تخلیقات میں عوامی شاعری کی بے ساختگی اور اعلیٰ فنی ضابطوں کی پیروی دونوں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ زبان کہیں بہت عامیانہ ہے تو کہیں اوسط درجے کی ادبی، اور کہیں عربی و فارسی کے دقیق الفاظ سے بوجھل۔ اوسط عامیانہ سے مراد ایسی زبان ہے جس میں عوامی روزمرہ کے ساتھ مانوس عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش سلیقے سے کی گئی ہو۔ ایسی زبان عام فہم بھی ہوتی ہے اور اس سے روانی و ترنم بھی پیدا ہوتا ہے۔ ''شاہراہ'' کی بیشتر شعری اصناف میں یہی زبان استعمال کی گئی ہے۔ ان شعری تخلیقات کا اسلوب کہیں احتجاجی ہے تو کہیں انقلابی، کہیں کہیں استہزائیہ فضا قائم کی گئی ہے۔ آخری شماروں میں عشقیہ اسلوب غالب ہے جس پر کلاسیکیت کا رنگ چڑھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح ''شاہراہ'' کا یہ شعری حصہ متنوع اسالیب کا حامل ہے۔

۳۔ ''تحریک''

اس رسالے کا زور قدروں کی آفاقیت پر تھا۔ اس کے مدیر ان انسان کی انفرادی آزادی کی پرزور وکالت کرتے تھے اور ادیب و شاعر کو بھی کسی سیاسی وابستگی سے باز رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ داخلیت پسندی کی شکل میں سامنے آیا۔ اور شعری تخلیقات میں وارداتِ قلبی کا بیان جدید انداز میں ہونے لگا جس کی تشکیل میں انفرادی تجربات کی بنیاد پر وضع کردہ استعارات و علائم کو بہت زیادہ دخل تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''تحریک'' نے جدیدیت کو اردو دنیا میں متعارف کرانے کا کام کیا۔ لیکن ایسے قلمکار بھی اس جریدے میں لکھ رہے تھے جو ادب کی قدیم روایت کو کسی طرح ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ترقی پسند تحریک سے تو وہ بے زار تھے ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ زبان و بیان کی سطح پر بھی کوئی تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ ''تحریک'' نے ان کی تخلیقات کو بھی شائع ہونے کا موقع دیا۔ ان شعراء میں معمر حضرات کی تعداد زیادہ تھی۔ نوجوان البتہ نئی لفظیات اور اسلوب بیان کو بصد شوق لبیک کہہ رہے تھے۔ لہٰذا ''تحریک'' میں اسلوب کی سطح پر مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ کریں :

نظم آزاد

خوفناک جنگل میں جاؤں ر سانپ مار کے کچا کھاؤں ر ناچوں

گاؤں شور مچاؤں ر ننگی کالی جشن کو آنکھ مار کے پاس بلاؤں ر... الخ

("نیند آئے تو" محمد علوی۔ جون ۱۹۶۸ء ص ۱۵)

ذہن کی سرحدوں سے الجھتا ہوا ر تنگ تاریک رستوں

کی چکنائی پر ر رقص کرتا ہوا ر دفعتاوہ شہادت کی انگلی پہ آکر رکا.... الخ

("پھر شہادت کی انگلی کو جنبش ہوئی" عادل منصوری جون ۶۸ ص ۱۵)

رات کی کالی دیوار گرتی رہی

رات ڈھلتی رہی

گہرے سائے بچھڑ کر بگڑنے لگے گونجتی بستیاں جیسے گونگے کھنڈر...

("لمحات کے حصار میں" جاوید اختر۔ نومبر ۶۸ء ص ۵۰)

نظم پابند

تم کہتی ہو وقت کا مرہم ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے

آج کے قصے کچھ برسوں کے بعد پرانے ہو جاتے ہیں

آشاؤں کے بے بس پنچھی تڑپ تڑپ کر سو جاتے ہیں

انساں جوں توں کرکے عمر بسر کرنی ہے کر لیتا ہے...

(سانیٹ۔ آزاد گلاٹی۔ مارچ ۶۸ء)

وہی ہے نور گریزاں وہی ہے مہر جمال

اسی سے جذب کی دولت اسی سے حسن خیال

اسی نے خاک سے انساں بنائے ہیں کیا کیا

اسی نے آگ سے گلشن سجائے ہیں کیا کیا...

(مثنوی "ثنائے لامحدود" حسن نعیم سلور جبلی نمبر ۷۸ء ص ۲۰۶)

مجھے کیا کیا دیا ہے زندگی نے کس کو بتلاؤں

مری آنکھوں میں کچھ آنسو مرے ہونٹوں پہ کچھ آہیں...

(نظم معریٰ "تمنا سربہ نواز" راشد آزر سلور جبلی نمبر ص ۲۱۱)

میری پسلی میں جما ہے کئی شہروں کا سکوت
جیسے سویا ہو کسی غار میں تہذیب کا بھوت ...
(قطعہ بند "شور شبستاں" چندر بھان خیال ایضاً ۲۲۴)

غزلیں

مطلع : ایک پر کیف غزل ہو جائے
دور وحشت کا عمل ہو جائے (کرشن موہن۔ دسمبر ۶۴ء)

" یاد پھر بھولی ہوئی ایک کہانی آئی
دل ہوا خون طبیعت میں روانی آئی (مخمور سعیدی۔ ستمبر ۶۴ء)

" میں ترے غم میں اب نہیں ناشاد
دے مری جاں مجھے مبارک باد (خلیل الرحمٰن اعظمی ستمبر ۶۴ء)

" جیتا ہے صرف تیرے لئے کون مر کے دیکھ !
اک روز میری جان یہ حرکت بھی کر کے دیکھ (عادل منصوری دسمبر ۶۴)

" اب بھی پل پل جی دکھتا ہے
جیسے سب کچھ ابھی ہوا ہے

(کمار پاشی اکتوبر ۶۳ء)

" آشفتگی پھر آج منالے گئی مجھے
اک کوئی رہ گزر تھی بلالے گئی مجھے (مصور سبزواری۔ دسمبر ۶۴ء)

" دوستوں کی باتوں میں جب خلوص پائے گی
میری فطرت سادہ پھر فریب کھائے گی (مظہر امام ۶۴ء)

" وہ جو تیرے ہاتھوں چڑ کے کھا جاتے ہیں مثلاً میں
تیری محفل میں آنے سے کتراتے ہیں مثلاً میں (مظفر حنفی ۶۴)

" جہان رنگ و بو کی سیر کر لے
سبق نظارے سے کچھ تو نظر لے (شہریار۔ اکتوبر ۶۳ء)

آج تو شام غم کے سائے ایسے ابھرتے آئے ہیں

دور کہیں جیسے اک ساتھ کئی دن ڈوبتے آئے ہیں (من موہن تلخ ۶۳ء)

ان شعری تخلیقات کے علاوہ رباعیات وقطعات بھی اس جریدے میں شائع ہوئے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ "تحریک" میں زبان وبیان کے علاوہ ہیئت کے تجربات بھی کیے گئے ہیں۔ نئے نئے قوافی اور ردیف کی تلاش "تحریک" کی غزلوں میں ملتی ہے۔ طوالت کے خوف سے ساری غزلوں اور نظموں کے نمونے نہیں دیئے گئے ہیں ورنہ اس جریدے میں ہمعصر مشاہیر کا کلام برابر چھپتا رہا اور ساتھ ہی بالکل نئے شعراء کو بھی اس میں چھپنے کا موقع ملا۔

"تحریک" کی شعری نگارشات کے مطالعے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ اس رسالے کا عمومی اسلوب تین طرح کا ہے۔ پہلا اسلوب ان شعراء کی تخلیقات کا ہے جو کسی ادبی نظریے کو نہیں مانتے ان میں زیادہ تر بزرگ شاعر ہیں۔ جن کو اپنی فنی روایات اس قدر عزیز ہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا زبان کا جو معیار اساتذہ قدیم نے قائم کیا تھا اس کی پابندی لازمی سمجھتے تھے۔ یہ اسلوب عربی وفارسی آمیز زبان' غزل کی مروجہ لفظیات اور صنائع لفظی ومعنوی سے تشکیل پاتا ہے۔ "تحریک" کے ابتدائی شماروں میں اس اسلوب کا غلبہ ہے۔

دوسری قسم میں وہ شعراء آتے ہیں جن کو اپنی فنی قدریں بھی عزیز تھیں لیکن نئے تجربے بھی ان کے لیے کشش رکھتے تھے۔ لہٰذا اس اسلوب کی تعمیر میں جدید وقدیم' روایت و تجربہ کی کامیاب وناکام دونوں طرح کی آمیزشیں پائی جاتی ہیں۔ اس اسلوب کی حامل تخلیقات میں ہمعصر مسائل کی گونج اور نئے محاوروں کا استعمال ملتا ہے۔

تیسری قسم کا اسلوب زبان کے روایتی ڈھانچے کو توڑ کر موجودہ صنعتی دور کی حسیت سے ہم آہنگ کرنے والی لسانی تنظیم کا عطا کردہ ہے۔ اس اسلوب کو وضع کرنے کے لیے لسانی سطح پر تھوڑی بہت توڑ پھوڑ ضرور کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا "تحریک" کے آخری دور کی نگارشات کا انداز بیان خالص تجربہ پسندی کا غماز ہے اور ان تخلیقات میں استعمال کی گئی زبان میں ایک طرح کا کھردرا پن نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ اس لفظیات سے قاری کی نامانوسیت ہے۔ کثرت استعمال اور کثرتِ قرأت و سماعت سے یہ کھردرا پن دور ہو جاتا ہے اور زبان رواں معلوم ہونے

لگتی ہے۔ المختصر "تحریک" اس تجربہ پسندی کا دہلی میں پہلا نقیب ہے جو آگے چل کر اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔

"تخلیق" "تلاش" "محور" "سطور"

ان رسائل میں آزاد نظمیں کثیر تعداد میں شائع ہوئیں۔ جدید شاعری کی خدمت کرنے میں یہ رسائل پیش پیش رہے۔ آزادی کے بعد جو نئے اسالیب بیان اردو میں متعارف ہوئے ان کی ترجمانی ان رسائل کی شعری اصناف میں ملتی ہے۔ نظم جدید کی مقبول ہیئتوں کی اشاعت بھی ان رسائل کا خاص وصف ہے۔ آزاد نظم ان میں سے ایک ہے۔ آزاد نظم کی خوبی یہ ہے کہ ایک رکن کو پوری نظم میں استعمال کیا جاتا ہے اور مصرعوں میں ارکان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ قافیے کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اگر سلیقے سے اس ہیئت میں نظم کہی جائے تو پڑھنے اور سننے میں دلکش معلوم ہوتی ہے۔ خیال کا اظہار بھی کامل اور موثر طور پر ہوجاتا ہے اور الفاظ کو خوبصورتی سے مصرعوں میں پرویا جائے تو موسیقی کا لطف پیدا ہوجاتا ہے۔ آزاد نظم کے اسلوب میں استعاراتی فضا تخلیق کرنے کا چلن عام ہے۔ علائم و تشبیہات بھی اس ہیئت میں زیادہ زیب دیتی ہیں بشرطیکہ فن پر عبور حاصل ہو ورنہ مہمل گوئی کا خدشہ رہتا ہے۔ زیر مطالعہ رسائل سے چند آزاد نظموں کے نمونے پیش ہیں :

اس نے پچھلے کسی جنم میں
ناگ راج کا سر کچلا تھا
جنم جنم سے
ناگن اس کو ڈھونڈ رہی ہے
جنم جنم سے
وہ خود سے چھپتا پھرتا ہے
اپنے ہی مردار بدنی میں
ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے
جس کے باہر اس کے لہو کی
گندھ نہ جائے

ناگن اس کو ڈھونڈ نہ پائے.... الخ

(کمار پاشی۔ سطور ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۶۴)

صبح کا سائرن سن کے جاگا

اور ریڈیو کی سوئی اک ہٹائی

تو گانے کی آواز ہر موج دہکے ہوئے سرخ لاوے کی چھاتی

ایک سفاک بجلی کے چابک کی مانند

سانپ کی جیبھ

سرخ نیلی خبر... الخ

("سانپ کی جیبھ" عمیق حنفی۔ سطور۔ ستمبر ۷۰ ص ۳۱)

نمائش کی دیوار پر ایک جلوہ

نئے وقت کی ایک سوغات تازہ

نیا ایک چہرہ

تجسس نے جس کے ہر اک زاویے کو کریدا ہے اکثر

وہی جنبش نازک

وہی ایک پیکر... الخ

("نیا چہرہ" وہاب دانش۔ تلاش۔ اپریل ۱۹۶۳ ص ۲۴)

زمیں کو چھو کر

نظر ستاروں کی سمت دوڑی

مگر طویل اور اداس عمروں کے فاصلے درمیاں پڑے تھے... الخ

("اداسیاں اب گریزپا ہیں۔" مبارک احمد۔ تلاش۔ جنوری تا فروری ص ۷۷)

نیند کا ایک شہر ہے

اک طلسمی کیف میں ڈوبا ہوا

شہر کے چاروں طرف استادہ ہے

ایک اونچی سی فصیل

اور اس پر چاند جیسی برجیاں

اور اک ننھا سا دروازہ فصیل شہر کا... الخ

("نیند کا شہر" محمد علوی- تخلیق- دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۲۰)

خواہش کی دیوار کے پیچھے

رنگ آلودہ پانی

پانی کے اک اک قطرے میں

سورج کی عریانی

عریانی میں پیلے پیلے

رنگوں کے دروازے.... الخ

("خواہش کی دیوار کے پیچھے" عادل منصوری- محور- اگست ۱۹۶۶ ص ۱۵۰)

حریف کون تھا؟ غلیظ بدنما سا جانور

وہ بے خبر

جو رینگتا ہوا چلا

جو رینگتا ہوا چلا گیا

نہ جانے کس جہان سے تمھاری رہ میں آگیا

اصول بن کے زندگی کے آسماں پہ چھا گیا... الخ

("خرگوش کا غم" بلراج کومل- محور- اگست ۶۶ء ص ۱۵۵)

آب خفتہ میں اک سنگ پھینکا تو ہے

دائرے

سطح ساکت پہ ابھرے ہیں

مچلیں گے

مٹ جائیں گے

اور وہ سنگ جاں

اپنی یہ داستاں

زیر بار جمود گراں

ایک سنگ ملامت کی مانند

دہرائے گا

(زاہدہ زیدی۔ سطور۔ شمارہ ۱۹۷۰ء ص ۶۰)

یہ آزاد نظمیں اپنے عہد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو علامتوں اور استعاروں کے پیرائے میں ظاہر کرنے کا کامیاب و موثر ذریعہ ثابت ہوئیں۔ ان کا اسلوب شروع سے آخر تک ایک ابہام سے ملفوف ہے۔ اس لئے عام قاری کے لئے ان کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنا ذرا دشوار کام ہے۔ لیکن ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے اور زبان و بیان کی نزاکتوں کو سمجھنے والے قارئین ان سے دیر تک محظوظ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے مفاہیم ہر قرأت میں الگ دکھائی دیتے ہیں۔ جتنی بار انھیں ہم پڑھیں گے ایک نئی معنوی فضا اتنی ہی بار ہمیں جلوہ گر نظر آئے گی۔ اور ان نظموں کے مطالب کسی ایک زمانی حدبندی کے بجائے لازوال ہو جائیں گے۔

نظم پابند

زیر مطالعہ رسائل میں آزاد نظم کی بہ نسبت پابند نظموں کی اشاعت کم ہوئی لیکن یہ پابند نظمیں اپنی خوبیوں کی بناء پر قابل ذکر ہیں۔ چند نظموں کے اقتباسات بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں :

مرے شہکار مرے فن کی تو معراج سہی
تجھ میں ایک خواب حسیں ٹوٹ گیا ہے میرا
ایک رنگیں سا فریب ایک دلاویز سا جھوٹ
کھل گیا ہے تو قلم چھوٹ گیا ہے میرا...

("نامکمل شاہکار" شہاب جعفری۔ تخلیق۔ نومبر ۱۹۶۱ء ص ۲۱)

چاندنی کے قافلے۔ تیرگی کی دھوپ میں۔ اپنا نور رو گئے
ظلمتوں میں کھو گئے..... الخ

("انتظار" عتیق تابش۔ تخلیق۔ نومبر ۶۱ء ص ۲۲)

تصورات میں اے جان آرزو تجھ سے
ہزار بار مرے دل گفتگو کی ہے

مری نظر تجھے پہچانتی نہیں لیکن
بغیر دیکھے تری میں نے آرزو کی ہے...
(قطعہ بند۔ "ان دیکھی محبوبہ سے" شباب للت۔ تلاش اپریل ۶۳ء ص ۲۲)

ختم ہو چکا اخبار
راکھ ہو چکا سگریٹ
دوست جا چکے مل کر
گفتگو کا دروازہ
بند ہو گیا کب سے
میں کہ پھر اکیلا ہوں
کاش چھو سکا ہوتا
کوئی میری تنہائی
("کب سے" شمیم فرحت۔ تلاش۔ اپریل ۶۳ء ۲۲)

خلا کی وادی میں سرگرم جستجو تھی نظر
نگاہ ڈھونڈ رہی تھی نشاط روے سحر

....

ہر ایک در پہ گئی پتھروں سے ٹکرائی
کسی طرف سے نہ آواز بازگشت آئی
ا کی وادی سے مایوس ہو کے لوٹ آئی
(ہیئت مثنوی۔ "افق" نصیر پرواز۔ تلاش۔ اپریل ۶۳ء ص ۱۳)

درد کی جلوہ گری جیسے پری سحر بھری
اپنی رعنائیوں سے آپ ہم آغوش رہے
آشکار اب جو ہوئی اور میں بیدار ہوا
اپنی دنیا سے نکل تیرا طلب گار ہوا
("نا آسودگی" قیوم نظر۔ محور۔ دسمبر ۶۶ء ص ۱۵۴)

دکھ ساگر کو متھتے متھتے
ہم نے اپنی جان گنوائی
کیا سوچا تھا اور کیا پایا
ایک کلس میں امرت نکلا
ایک کلس میں زہر بھرا تھا
کون لوگ تھے کیسے آئے
دیو لوک کی پہنے کایا
وہ امرت کے متوالے تھے
قطرہ قطرہ سب پی ڈالا

(اپنا حصہ اور ہی کچھ تھا۔ "نیل کنٹھ" راج نرائن راز۔ ص ۱۱۸)

رباعیات / دوہے / گیت

رباعی

ابھرا ہے کنار غم سے مہتاب غزل
اشکوں سے چمک اُٹھی ہے محراب غزل
مہکا ہے جو لالہ زار تنہائی کا
یاد اس کی بنی ہے سرو شاداب غزل

(کوثر جائسی۔ تخلیق۔ دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۹)

ناشاد ہیں کیا تم سے شکایت کرتے
بس چلتا تو دیواروں سے ٹکرا مرتے
خالی ہیں کہاں راہبروں سے راہیں
پھر موت سے ہر موڑ پہ کیسے ڈرتے

(باقر مہدی۔ سطور۔ ستمبر ۹۷ء ص ۴۶)

دوہا

ان کے سنگ اشنان نہ کرنا اے گوری چنچل
جن کے من میں پاپ کی کالک ہاتھ میں گنگاجل
(سیف زلفی۔ محور۔ اگست ۶۶ء ص ۶۵)

پرسوں ہی جس سے ہوئی ایک سرسری بات
سنا وہ گڑیا کانچ کی ٹوٹ گئی کل رات
(بھگوان داس اعجاز۔ سطور۔ اگست ۱۹۸۰ء ص ۳۰)

گیت

پریم کے شبد ہیں اس میں ڈولے ان سے من پر چاؤ
پریم کے بول ہیں بڑے منوہر ان سے دھیان بساؤ
(تاج سعید۔ تلاش۔ جنوری تا اپریل ۶۴ء ص ۷۹)

غزلیں

رقص کرتے ہوئے لمحات نے سونے نہ دیا
مجھ کو ساون کی حسیں رات نے سونے نہ دیا
(قتیل شفائی۔ تخلیق۔ اکتوبر ۶۱ء ص ۶۱)

حرف تسکیں بھی نہیں وعدۂ فرد ابھی نہیں
اور اس کفر محبت کا مداوا بھی نہیں
(اطہر صدیقی۔ اکتوبر ۶۱ء ص ۶۱)

خشک پتے ہیں آندھی ہے بن باس ہے
سرپھروں کو یہی زندگی راس ہے
(نور بجنوری۔ محور۔ اگست ۶۶ء ص ۱۷)

میں ہوں پوس کی ڈھلتی رات سارا نگر سنسان
دور گلی کے موڑ پہ اک سایہ ساکھڑا حیران
(ناصر شہزاد۔ محور ۷۰)

رات مرا سایہ بھی مجھ سے روٹھ گیا تھا
چاند تھا لیکن اک بادل میں چھپا تھا
(شمیم حنفی- محور- دسمبر ۶۶ء ص ۱۷۵)

دیوار و در کو چپ کی نگہ چومتی گئی
آنگن کی دھوپ جانے کسے ڈھونڈتی گئی
(مشہود انور- محور- دسمبر ۶۶ء ص ۱۷۶)

ستارو کچھ تو بتاؤ کہ ہے عجب عالم
یہ آنکھیں ہوتی ہیں کس طرح ہجر میں پرنم
(اقبال احمد خاں جامعی- ص ۱۷۷)

دیر و حرم کے فتنہ و حشر سے اماں رہے
رندوں کے سر پہ سایہ پیر مغاں رہے
(مجنون گورکھپوری- تلاش- جنوری تا اپریل ۶۴ء)

ہیں بہت آزردہ موجوں سے مگر دریا میں ہیں
ترک دنیا کرنے والے بھی اسی دنیا میں ہیں
(پرویز شاہدی- تلاش- ص ۲۲۶)

شعلہ سا کوئی برق نظر سے نہیں اٹھتا
اب کوئی دھواں دل کے نگر سے نہیں اٹھتا
(سجاد باقر رضوی- تلاش ص ۲۲۷)

عشق سے اپنے تبھی ہو کہ زمانے سے چھنی
اس نے پوچھا نہیں افسوس کہ کیا ہم پہ بنی
(حسن نعیم- تلاش ص ۲۳۱)

نکلیں نہ گھر سے سوختہ تن دوپہر کے بعد
دوچند ہوگی دل کی جلن دوپہر کے بعد
(فضیل جعفری- تلاش- جنوری تا اپریل ۶۴ء ص ۲۳۴)

چھیڑا ذرا صبا نے تو گلنار ہوگئے
غنچے بھی مہ جمالوں کے رخسار ہوگئے

(بشر نواز- تلاش ص ۲۳۵)

میں سروش فکر و نگاہ کو کبھی بھول کر بھی صدا نہ دوں
یہ عجیب شرط وفا ہوئی کہ جو تم کہو میں وہی کروں

(بشیر بدر تلاش ص ۲۳۶)

سفر درپیش کیسے دشت کا تھا
مرے آگے مرا ہی نقش پا تھا

(منیب الرحمٰن- سطور- مئی ۱۹۸۳ء ص ۵۱)

کوئی یوسف نہیں ہے اور کاروبار پھیلا ہے
ہمارے سامنے اک مصر کا بازار پھیلا ہے

(مظفر حنفی- سطور- ج ۱ ش ۱ ص ۳۴)

محبت میں وفاداری سے بچئے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچئے

ندا فاضلی- سطور- ج ۱ ش ۱ ص ۳۶

مذکورہ مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ تخلیق ر تلاش ر محور اور سطور میں شائع ہونے والی شعر نگارشات ایک نئے آہنگ کی حامل تھیں- ان تخلیقات کا اسلوب نئے فکری رجحانات سے متاثر ہے- ان میں اپنے اطراف میں پھیلی بے چینیوں اور باطنی کیفیتوں کا بیان بڑے اچھوتے انداز میں ملتا ہے- انسانی زندگی کو عصری علوم کے ذریعے سمجھنے کی جو کوشش جاری ہیں ان کا عکس ادب بھی قبول کر رہا ہے مندرجہ بلا رسائل میں ان کی شعری اصناف کے حوالے سے یہ خصوصیت موجود ہے- ان اصناف میں عشق و محبت کی نئی جہتیں اور اس کے حوالے سے نفسی کوائف کا بیان بھی ان تخلیقات میں ملتا ہے- صنعتی تہذیب اور سماج کے دیگر مسائل بھی ان میں منعکس ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں- ان میں زبان و بیان کی دلکشی بھی ہے اور جدت بھی- ہیئت و تکنیک کی سطح پر تنوع اور جاذبیت ان نگارشات کی خوبی ہے- ان میں زبان کا استعمال جدید انداز پر کیا گیا ہے- استعاروں، علامتوں اور تشبیہوں میں

انفرادیت ہے اور پیکر تراشی تمثیل نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ان رسائل میں عمدہ شعری تخلیقات کثرت سے شائع ہوئی ہیں۔ موضوعات میں بھی دلکشی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان موضوعات کو ہمارے روز مرہ کے حالات و واقعات کا عکس کہا جاسکتا ہے جو شعر کے پیکر میں ڈھل کر جمالیاتی انبساط کا سبب بنتے ہیں۔

''عصری ادب'' اور ''عصری آگہی''

ان رسائل میں شائع ہونے والی شعری اصناف جن میں غزلیں' پابند' آزاد' معری اور نثری نظمیں' قطعات و رباعیات' دوہے اور سانیٹ شامل ہیں' انسانی سماج اور حیات و کائنات کے مسائل و معاملات نیز واردات حسن و عشق سبھی کچھ ہمیں ملتا ہے۔ اشتراکی مزاج کے باوجود ان میں جدید لب و لہجے کی پرچھائیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ان رسائل نے تمام مروجہ شعری ہیئتوں کی پذیرائی کی ہے جن میں زبان و بیان کی رنگا رنگی اور دلکشی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

نظم پابند

بہار آئی تو جیسے یک بار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مرمٹے ہیں....

(''بہار آئی'' فیض احمد فیض۔ عصری ادب۔ جولائی ۱۹۷۶ء ص ۳۶)

آزاد نظم

میں پیمبر نہیں ردیوتا بھی نہیں
دوسروں کے گناہوں کی پاداش میں
موت سینے سے اپنے لگائے ہیں وہ رزخم کھاتے ہیں وہ... الخ

(''میں۔ تمہاری ایک تخلیق'' اخترالایمان۔ عصری ادب۔ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء ص ۴)

وہی بہتے ہوئے دریا کے غم کا سیل بے حاصل

ادای صورت ساحل
سراب ریگ تاحد نظر
اور سیپیاں چنتی ہوئی آنکھیں
وہی اُلڈی شفق
سہمی زمیں
لرزاں افق۔ بے برگ شاخیں
بے صدا چہرے.... الخ

(ساجدہ زیدی۔ عصری ادب۔ جولائی ۷۹ء ص ۱۰۳)

نثری نظم

تم کیسے سمندر صورت ہو
اک بوند سے کم
تم سارے جزیروں کے دشمن ہو
تیز ہواؤں سے یہ بے بادبان کشتیاں اکتا چکی ہیں
کنارے تک پہنچنا ان کے لئے ممکن نہیں
اور کوئی جزیرہ تم نہیں بننے دوگے
تم کیسے سمندر صورت ہو

(آمنہ ابوالحسن۔ عصری ادب۔ جولائی ۷۵ء ص ۱۰۸)

گیت

لہر لہر ندیا درپن میں
دیکھنا میرے نیناں ہیں
بجری کوئل کوک گھٹا میں
سننا میرے بہنا ہیں.... الخ

(سوہن راہی۔ عصری ادب۔ جنوری تا اپریل ۸۸ء ص ۱۳۱)

نوحہ (بہ ہیئت نظم آزاد)

رات طوفان میں اک شجر گر پڑا
وہ پرانا شجر ایک مدت پتوں سے محروم تھا
اس کی بے روح شاخوں سے تنگ آکے سارے پرندے
ہوا ہو چکے تھے.... الخ

(زہرہ ماجد علی۔ عصری ادب۔ جنوری تا اپریل ص ۱۳۰)

قطعہ

تیرے جمال سے دونوں جہان روشن تھے
جہاں جہاں ترے جلوے رات گھوم آئے
کہیں نگاہ کی مستی کہیں شباب کے پھول
جبیں ستاروں کی تیرے جنوں میں چوم آئے

صابردت۔ عصری ادب۔ جنوری تا اپریل ص ۱۳۱

نرم زلفوں کی جواں شام لیے بیٹھے ہیں
ان کی آنکھوں کے حسیں جام لیے بیٹھے ہیں
پاس آئے نہ ہمارے غم دوراں اس وقت
ہم علاج غم ایام لئے بیٹھے ہیں

(صابردت۔ عصری ادب۔ جنوری تا اپریل)

آزاد نظم

آگے اور بھی رستے ہیں
دھند حلقوں میں لپٹا سہما
شہر نیا ہے ر بھوک غریبی بیماری ہے
آنکھ مچولی کھیلنے والے لوگ
وہاں بھی ہیں.... الخ

(شہریار۔ "آگے اور بھی رستے ہیں" عصری آگہی ستمبر۹۷ ص ۴۵)

نظم پابند

میں جہاں بھی گیا ارض وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لئے
تیری حرمت کے چراغوں کی کسک ساتھ گئی
تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی
....

(فیض۔ ''فلسطینی شہیدوں کے نام'' عصری آگہی۔ مارچ ۸۰ء)

نثری نظم

ہم نے چاہا تھا کہ....
یہ درد جو ٹھہرے
تو کہیں ذہن کے گوشے میں
بس ایک شکل تمہاری بن جائے
وہی مبہم سا تبسم وہی مانوس خدوخال... الخ

(ساجدہ زیدی۔ عصری آگہی۔ نومبر ۸۰ء ص ۲۲)

غزلیں

''عصری ادب''

چمن ہے مقتل نغمہ اب اور کیا کہیے
بس اک سکوت کا عالم جسے نوا کہیے

(مجروح۔ جولائی ۷۹ ص ۹۹)

دکھوں سے قرب کا رشتہ نہ رکھنا
سفر کی راہ میں صحرا نہ رکھنا

(پرکاش فکری جولائی ۷۹ ۱۰۰)

حرف دل نارسا ہے ترے شہر میں
ہر صدا بے صدا ہے ترے شہر میں

(مظہرامام۔ اکتوبر۷۹ء تا جنوری ۸۰ ص ۲۰)

دھوپ سر پر ہے تو پھر بے سائباں زندہ رہو
اے مرے اطہر نفیس اے جان جاں زندہ رہو

اطہر نفیس " " "

گھنے دھوئیں میں فرشتے بھی آنکھ ملتے ہیں
تمام رات کھجوروں کے پیڑ جلتے ہیں

(بشیربدر۔ اکتوبر۷۸ء ص ۹۱)

فروغ دیدو دل لالہ سحر کی طرح
اجالا بن کے رہو شمع سحر کی طرح

علی سردار جعفری۔ اکتوبر۷۸ء ص ۸۹

اداسیوں کے سوا دل کی زندگی کیا ہے
کسے بتایئے خوابوں کی برہمی کیا ہے

معین احسن جذبی۔ جولائی اکتوبر۷۶ء ص ۲۷

عصری آگہی

کوئی بہار کا جھونکا تو کیا سنوارے گا
وہ برگ ہوں جسے دست جواں نکھارے گا

حسن نعیم۔ مئی ۷۹ء ص ۴۲

آئندہ گاں کی راہ بناتی رہی ہوا
آثار رفتگاں کے مٹاتی رہی ہوا

وحید اختر " "

بدن کا سارا تناؤ آنکھوں میں کھنچ گیا تھا
مگر وہ دلال جو ہڈیوں میں پھنسا ہوا تھا

عتیق اللہ " " ۴۲

کیا کیا نہ چھین کے وہ ستم گار لے گئے
اچھا ہوا کہ قوت گفتار لے گئے

حامدی کشمیری " "

پہلی الفت کے زخم بھرجائیں
پھر یہ سوچیں گے ہم کدھر جائیں

شہریار " " ۴۸

متذکرہ بالا مثالوں سے "عصری ادب" اور "عصری آگہی" کا شعری اسلوب سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ان رسائل میں افادیت کا عنصر بھی شامل ہے لیکن جدیدیت کا عطا کردہ استعاراتی وعلامتی لہجہ بھی انتہائی نمایاں ہے جتنا جدیدیت کے ترجمان رسائل میں۔ ان رسائل نے سماجی حقیقت نگاری پر اس قدر اصرار نہیں کیا جتنا "شاہراہ" نے کیا تھا۔ ان کی شعری تخلیقات میں سماجی نفسیات اور انفرادی محسوسات یکساں طور پر موضوع بنے ہیں جن کی زبان بھی جدید ترین زاویوں کا ساتھ دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مختلف اصناف اور مختلف ہیئتوں میں قلبی واردات کو جہاں جدید لب ولہجے میں پیش کیا گیا ہے وہیں کلاسیکی انداز بیان بھی جگہ جگہ دکھائی دے جاتا ہے۔ اس طرح ان رسائل کا شعری حصہ مفید بھی ہے اور ذوق جمال کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

"تناظر" "معیار" "شعور" "ذہن جدید"

ان رسائل میں شامل شعری تخلیقات کا مزاج گذشتہ رسالوں سے ملتا جلتا ہی ہے۔ استعارات وعلائم، حسی پیکروں اور تمثالوں کے وسیلے سے بات کہنے کا انداز ان رسالوں میں بھی اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح جدیدیت کے گذشتہ رسائل میں تھا۔ ان رسائل کی شعری تخلیقات میں اپنے عہد کے مسائل سے چشم پوشی اختیار نہیں کی گئی ہے بلکہ انھیں اپنے تجربات وتخیلات کی آمیزش سے خوبصورت فنی پیکروں میں ڈھالا گیا ہے۔ ان جرائد کا شعری حصہ اس لئے قابل مطالعہ ہے کہ وہ ایک طرف عصر حاضر کے انسان کی نفسیات کو سمجھنے میں معاون ہے دوسری طرف عصری زندگی کی بے ربطگی وبے کیفی سے واقف ہونے اور مسائل کے متعلق غور وفکر کرنے کی تحریک بھی ان سے ملتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے :

تناظر : نظمیں

رابطے ٹوٹ گئے

درد سے بھی کوئی رشتہ نہیں

وہ تو پچھلی کسی منزل پہ تھما رہ گیا

اب تو شاید

اپنی میعاد بھی وہ کاٹ چکا.... الخ

"عمر گریزاں" قاضی سلیم۔ شمارہ ۲ ص ۲۲

نیند میں ڈوبی / تمہاری جھیل سی آنکھوں میں

کوئی عکس ابھرے اور میں ایک لمس بن کر / یاد آؤں

گدگداؤں

"لمس" یعقوب راہی ص ۲۴۹

یہ بستر تنہائی / رجی میں ہے لپیٹوں میں / اے رات وجود اپنا

کبھی تو سمیٹوں میں... الخ

"اے رات" شہریار ص ۲۴۸

جسم کے مادی پیرہن سے جھلکتی ہوئی

لذتوا، کی فراوانیاں ہیں

ایک شوریدہ سر خواہشِ زیست ہے

روح کی ناصبوری ہے.... الخ

"ملبے کے نیچے" ساجدہ زیدی ص ۲۵۹

"معیار"

جیسے بارش ابھی ابھی تھمی ہے

ہوا ایسی ہے

کہیں کہیں سے کبھی کبھی کسی کوئل کا نغمہ مجبوری

شام دروازے پر دستک دے رہی ہے... الخ

"حیرت کی منزل پر حسن کی نشانیاں" منیر نیازی۔ مارچ / ۱۹۷۷ء

کس کی خاطر شہر کے اندر شہر کے باہر شعور
کس کو لفظ کے باغیچے میں ڈھونڈیں چاند چکور
میرے سائے میں کوئی اور ---- الخ

"میرے سائے میں" جیلانی کامران- پہلا شمارہ

"شعور"

وہ طلسمی دوپہر تھی
سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹی میں شعاعیں اگ رہی تھیں... الخ

"شعور" ساقی فاروقی- شعور مارچ ۱۹۷۸ء ص ۲۴۶

صبح سے آنکھ ملتے ہی دل میں
پھر سے روشن ہوا کسی کا نام
فاصلے پھوٹ نکلے اندر سے
روشنی جیسے کوئی اجلا نام... الخ

محمد سلیم الرحمٰن- مارچ ۷۸ء ص ۲۸۸

"ذہنِ جدید"

بستر میں لیٹے لیٹے کیا دیکھ رہا ہوں
رینگ رہے ہیں صوفے کے نیچے زہریلے سانپ
کرسی کے اوپر اک کالی بلی بیٹھی ہے
بند دریچے سے اندر یہ کون چلا آیا ہے... الخ

مخمور سعیدی- ستمبر تا نومبر ۹۰ء ص ۸۵

ساتویں منزل سے دیکھو تو
شہر عجیب سا لگتا ہے
دور دور تک گھر ہی گھر
اور پیڑ ہی پیڑ کھڑے ہیں

سب کتنا اچھا ہے لیکن ر بے مطلب سا لگتا ہے

محمد علوی۔ذہن جدید۔ " " ص ۷۹

جیوری ہاؤس میں رکھی

تمہاری لاش

اس قدر چیر پھاڑ دی گئی ہے

کہ تم خود بھی اسے نہیں پہچان سکتے

یوں بھی ر خود کو پہچان لینے والا امر ہو جاتا ہے

اور تم تو مر چکے ہو

"تعزیت" فرحاں حنیف۔مارچ تا مئی ۹۴ء ص ۹۴

غزلیں

ہری سنہری خاک اڑانے والا میں

شفق شجر تصویر بنانے والا میں

بانی رتناظر رپہلا شمارہ ۹۵

شرر برف آنکھوں کا منظر دھواں

یہ چاند سارا سمندر دھواں

حکیم منظور ر " ر ص ۹۹

بن گیا ہے کون سا غم دشمنِ جاں کیا کہیں

غمگساروں سے ہم اپنے دل کا عالم کیا کہیں

مخمور سعیدی ر " ر۱۰۱

خالی جگہ ہے جو ر گراں اس کا کیا بتاؤں

آبادیوں میں کم ہوں جہاں اس کا کیا بتاؤں

شمس الرحمٰن فاروقی ر " ر۱۰۸

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے

مرے لہو کے سمند ذرا پکار مجھے

خلیل الرحمٰن اعظمی رمعیار ردسمبر ۷۷ ص ۹۵

جنگلوں کی یہ مہم ہے رختِ جاں کوئی نہیں
سنگ ریزوں کی گرہ میں کہکشاں کوئی نہیں

حسن نعیم رمعیار ردسمبر ۷۷ء ص ۹۴

غائب ہر منظر میرا
ڈھونڈ پرندے گھر میرا

بانی رمعیارر دسمبر ۷۷ء ص ۹۸

یہ تو ممکن نہیں چپ چاپ فنا ہو جاؤں
میں تو سناٹا ہوں بکھروں تو صدا ہو جاؤں

شاذ تمکنت ر" ر" ص ۱۰۰

باہر کے اسرار لہو کے اندر کھلتے ہیں
بند آنکھوں میں کیسے کیسے منظر کھلتے ہیں

ساقی فاروقی رذہن جدید رتمبر تا نومبر ۹۲ء ص ۴۲

خراب جوش نمو فصل فصل آرزو کیوں ہو
کسی سبب ہو مگر رائیگاں لہو کیوں ہو

یعقوب راہی ر" رجون تا اگست ۹۳ء ص ۱۷

لوٹیں عدو جو امن تو لڑتا نہیں کوئی
یہ شہر خوف ہے یہاں زندہ نہیں کوئی

ارشد عبدالحمید ر" رسمبتر تا نومبر ۹۳ء ص ۱۵۴

درج بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ زیر بحث رسائل کے مجموعی اسلوب پر جدیدیت کا رنگ کافی نمایاں ہے۔ خارجی حادثات و واقعات اور ان کا ردِّعمل انفرادی تجربے کی شکل میں اظہار کا پیکر اختیار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان رسائل کی شعری تخلیقات میں زندگی کو قریب سے دیکھنے کا رجحان ملتا ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ تہذیب نے زندگی کی مسلمہ قدروں کو جس تنزلی کی طرف دھکیلا ہے اس کے خلاف احتجاج کی آواز ان رسائل کی شعری نگارشات میں نمایاں طور پر سنائی دیتی ہے لیکن یہ آواز بے ہوشی میں نہیں بلکہ عالم شعور میں بلند کی گئی ہے۔ ان رسائل میں احتجاج کا لہجہ فن کی حدود سے باہر نہیں نکلنے پاتا ہے۔ ہر دور کے کچھ

مخصوص مسئلے ہوتے ہیں، مخصوص حالات ہوتے ہیں جن کا شاعری میں اظہار اس وقت تک کامیابی سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ زبان زندگی کی تبدیلیوں کا ساتھ نہ دے اس لیے فن کار کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو نئی لفظیات وضع کرے یا پھر پرانی لفظیات کو عصری حالات کے مطابق نئی معنویت عطا کرے۔ ان رسائل کی تخلیقات میں دونوں باتیں نظر آتی ہیں۔ بعض شاعروں کے یہاں نئی لفظیات وضع کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے اور بعض کی روایتی زبان کو نئی معنوی جہتیں بخشی ہیں۔ انھوں نے صنعتی تہذیب سے پیدا شدہ اشیاء سے شاعری کی زبان کو وسعت دی ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا رسائل کا اسلوب آج کا پسندیدہ اسلوب بن گیا ہے۔

''بیسویں صدی'' ''کتاب نما'' ''ایوان اردو''

مندرجہ بالا رسائل میں شائع ہونے والی شعری نگارشات کے موضوعات و اسالیب کو کسی خاص طرز فکر یا نظریے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سرتاسر غیر جانب دار جریدے ہیں۔ ہر دور کے مستند اور نئے فنکار ان میں چھپتے رہے ہیں۔ ''بیسویں صدی'' گرچہ ایک عوامی پرچہ ہے لیکن مشاہیر ادب کی تخلیقات اس میں ہمیشہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس میں شائع ہونے والی نگارشات خواہ کسی فکر کی حامل ہوں لیکن ان میں عوامی دلچسپی کا عنصر ضرور شامل ہونا چاہیے۔ ''کتاب نما'' سنجیدہ ادبی پرچہ ہے اور اس میں عام دلچسپی کے علاوہ اعلیٰ ذوق رکھنے والے ادب کے قارئین کی ضرورت کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ''ایوان اردو'' کی نگارشات کا بھی یہی مزاج ہے۔ ان رسائل میں تقریباً سبھی شعری اصناف شائع ہوتی رہی ہیں، جن میں ہیئت و تکنیک کے تجربوں کا بھی سراغ مل جاتا ہے۔ ان تمام رسائل کا شعری حصہ ہمعصر ادبی رویّوں کا ترجمان ہے۔ ذیل میں ان رسائل سے چند شعری تخلیقات کے اقتباسات پیش ہیں :

نظم

ہم دیکھیں گے

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے

جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں

روئی کی طرح اڑ جائیں گے..... الخ

''ہم دیکھیں گے۔ فیض احمد فیض'' ''بیسویں صدی'' ستمبر۷۹ء

ہاتھی دانت کے اس جنگل میں اس کا کالا جسم

کالا بادل جو منڈلائے

کالی بجلی جو لہرائے

کالے اعضاء کا دریا جو

سمٹے سکڑے اور بل کھائے

آگ برستی دھوپ میں چمکے

اور نیزہ بن جائے.... الخ

''حبشی میرا بھائی'' علی سردار جعفری۔ بیسویں صدی۔ سال نامہ جنوری۷۹ء

پچھلی رات کو نیند نہ آئی

میں نے اک تصویر بنائی

اس تصویر نے مجھ سے پوچھا

کون ہو تم او میرے بھائی

میں بولا اک قیدی ہوں میں

جس کی قسمت ہے تنہائی.....

''بھائی'' خلیل الرحمٰن اعظمی۔ بیسویں صدی۔ سال نامہ ص۔۴۱

عجب کیا دامنِ یوسف کی قسمت ان کو مل جائے

کراچی میں جو کچھ تارِ گریباں چھوڑ آیا ہوں

کوئی دست حنائی یوں ہی لہرایا تھا چلمن میں
میں ٹکڑے کرکے اپنے جیب و داماں چھوڑ آیا ہوں....

"پُر افشاں بوسے" کیفی اعظمی۔ فروری ۷۹ء ص-۲۱

رباعیات

رکھتا ہوں قدم نور کے ہر زینے میں
آتا ہوں نظر آگ کے آئینے میں
شاعر ہوں نئے دور کا دیکھو تو ذرا
کیوں لاش ہے سورج کی مرے سینے میں

پریم وابرٹنی۔ بیسویں صدی۔ فروری ۱۹۷۹ء ص-۹۳

جب شب کی گھنی زلف بکھر جاتی ہے
جب یاد تری ذہن میں لہراتی ہے
اس وقت مری روح کی گہرائی سے
سناٹے کے رونے کی صدا آتی ہے

پریم وابرٹنی۔ بیسویں صدی۔ فروری ۱۹۷۹ء ص-۹۳

قطعات

کوئلوں نے فضا میں بکھرائے
کیف پرور مدھر شرابی گیت
ساون آیا تو حسن کے لب پر
پھر مچلنے لگے گلابی گیت

آم کے باغ پھول ہریالی
ننھی بوندوں کی ٹھنڈی پھوار
یہ حسینوں کی باہیں پھیلیں
یہ امنگوں کا جذبہ سرشار

باوا کرشن گوپال مغموم۔ بیسویں صدی۔ اکتوبر ۷۹ء ص-۲۲

دل و نگاہ کو بخشی ہے روشنی کس نے
کیے بلند مقامات آدمی کس نے
نوا کا سوز جو اقبال لے گیا تھا ہمیں
وہ اختیار کیا رنگ شاعری کس نے...

"بیادِ اقبال" احسان دانش۔ بیسویں صدی۔ ستمبر۷۹ء ص۔۲۸

جن آنکھوں نے پھوٹ پھوٹ کر
موسم کی تبدیلی کا احساس دیا تھا
شاخ شاخ / عہد سبز کا نغمہ گایا تھا تیز ہوائیں
ٹوٹ ٹوٹ کر گر جاتے ہیں
جن سے دل میں، دھنک کھلی رہتی ہے / جن کی خوشبو
سانسوں میں آہستہ آہستہ بہتی ہے... الخ

"نغمہ گروں کا نوحہ" کتاب نما۔ جولائی ۷۸ء ص۔۳

پرانی بات ہے لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
ہمیشہ ان کے ہونٹوں پر / مقدس آیتوں کا ورد رہتا ہے... الخ

"عاقبت اندیش بیٹے" زبیر رضوی۔ کتاب نما۔ جنوری ۸۶ء دسمبر ۸۵ء

سنو تم / یہ میرا تمہارا جو رشتہ ہے / اک راستہ ہے / میں تم سے گزر کر ہی
تم تک پہنچنے کی رفتار ہوں / میرا آغاز تم... الخ

ہائکو

۱۔ اف یہ سناٹا
کرمک تک کی، سانسوں کو
ٹیلو نے چاٹا

۲۔ ننھی مچھلی / دھارے کے مخالف کیوں کر / تیزی سے تیری

ناز قادری۔ ایوان اردو۔ جولائی ۸۹ء ص۔۲۴

دوہے

سانجھ پڑے بجنے لگے کوٹھے اور بازار
اس منڈی میں ایک شے بکے ہزاروں بار
کوٹھے ناچے ویشیا گھائل گھنگرو گائے
من مندر میں ایک چھپ تن بن گیا سرائے
کوٹھے کنیالے جنم لوگ کہیں ا. میشاپ
زینہ چڑھتے سوچنے کون ہے اس کا باپ

بھگوان داس اعجاز۔ ایوان اردو۔ اگست ۹۰ء ص-۱۶

نظم

رقص ہر جانب مشینی بھوت کا
حکمرانی ہر طرف فولاد کی
اجتماعی زندگی کا شور و شر
روح ہرسو مضطرب افراد کی
آرزوئیں زیرِ دام روز گار
خواہشوں پہ غلبۂ فکر معاش
دور آہن میں سکوں کی جستجو
دوپہر میں اپنے سائے کی تلاش

غزلیں : بیسویں صدی

ناکامیِ طلب سے نہ اتنا نڈھال ہو
ممکن ہے یہ بھی دعوتِ فکر و خیال ہو

احسان دانش۔ جنوری ۷۹ء ص-۳۶

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

فیض مارچ ۷۹ء ص-۱۹

سر پر کسی دیوار کا احسان تو ہوگا
سایہ نہ سہی سائے کا امکان تو ہوگا

غلام ربانی تاباںؔ- فوری ۸۷ء ص-۴۱

زمانہ تیری ذہانت کا جب عدو ہوگا
مری نگاہ میں اس دم تو سرخ رو ہوگا

حسن نعیم- فروری ۸۷ء ص-۵۷

کتاب نما

سب ہنر آتے تھے لیکن عقل سے یاری نہ تھی
صَرف کیسے روز و شب ہوں اس کی تیاری نہ تھی

حسن نعیم- جنوری ۸۹ء ص-۹

سیاہ شب سے نبرد آزما ہوئے تو سہی
چراغ ایک ہی دو تھے مگر جلے تو سہی

فضیل جعفری- جنوری ۸۹ء ص-۱۲

سستا خون اور مہنگا پانی
بول ری مچھلی کتنا پانی

نور تقی نور- فروری ۸۹ء ص-۳۲

آنسو آنسو ہر قطرہ شبنم کا ہے
یہ منظر یہ گریہ کس موسم کا ہے

قتیل شفائی- فروری ۸۸ء

آزاد غزل

مجھ سے کرتی نظر آتی ہے یہ ارشاد غزل
تو لکھ اب کوئی آزاد غزل

مظہر امام

غزل

اب قہر بھی میرے خدا کا دیکھیے
بس ہونے والا ہے دھماکا دیکھیے

شجاع خاور اپریل ۸۵ء ص-۱۳

یہ رنگ نغمۂ دلکش زباں کچھ اور کہتی ہے
یہ اندازِ سکوت اپنی فغاں کچھ اور کہتی ہے

جگن ناتھ آزاد- جنوری تا دسمبر ۸۸ء

ہم اہل دل کی شہر میں رسوائی تو نہ ہو
اک بے وفا کی اتنی پذیرائی تو نہ ہو

شہریار- اگست ۸۹ء

ایوان اردو

اس اعتبار سے بے انتہا ضروری ہے
پکارنے کے لیے اک خدا ضروری ہے

شجاع خاور- اگست ۸۷ء ص-۲۳

ترے چراغ مرا دل بجھانا چاہتے ہیں
ہوا کے ہاتھ کرشمے دکھانا چاہتے ہیں

اسعد بدایونی- اگست ۹۰ء ص-۲۲

جس اجالے کی طرف دیکھا اندھیرا نکلا
کیا مرے خواب تھے اور کیسا نتیجہ نکلا

حیات لکھنوی- فروری- ۸۹ء ص-۱۳

اٹھا کے پھینک دیے ٹکڑے سوکھی روٹی کے
یہ بھوکے بچے کسی اونچے خاندان کے ہیں

ظہیر رحمتی- جولائی ۸۷ء

متذکرہ بالا مثالوں سے "بیسویں صدی" "کتاب نما" اور "ایوان اردو" کا مزاج سمجھنے میں مدد ملتی ہے- ان رسائل کی شعری تخلیقات میں ہمعصر سیاسی سماجی و تہذیبی مضامین

کے علاوہ معاملاتِ حسن و عشق سے متعلق احساسات کا ذکر بھی بخوبی کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ فن کار کے اندرون کی وہ کیفیات جو آج کے خود غرضانہ ماحول نے عطا کی ہیں، کا بھی فن کارانہ اظہار ان شعری تخلیقات کا خاصہ ہے۔ متنوع اسالیب کی حامل یہ شعری اصناف اپنے دور کی حسیت کی ترجمانی کا کامیاب نمونہ ہیں۔ جن میں شدت تاثر بھی ہے اور جمالیاتی حسن بھی۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ان میں جگہ جگہ ندرت اور تجربہ پسندی کا رجحان ملتا ہے۔ نئے دور کے مزاج کی شناخت کے لیے ان رسائل کی شعری نگارشات کا مطالعہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ رسائل اردو کے شعری اسلوب کو نئی جہتوں سے روشناس کرانے میں کافی معاون ثابت ہوئے ہیں۔

باب پنجم

ادبی رسائل میں نثری اصناف اور ان کا تنقیدی جائزہ

ا۔ افسانہ نگاری

آزادی کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے اردو کے ادبی رسائل میں اردو کی نثری اصناف کو کافی فروغ ملا۔ ان اصناف میں افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ و طنز و مزاح قابل ذکر ہیں۔ باقی اصناف نثر میں سفرنامے، خاکے، رپورتاژ اور خود نوشت سوانح وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ چونکہ افسانہ ایک ہر دل عزیز صنف ہے ان رسالوں کی اشاعتوں میں اس پر خصوصی توجہ دی گئی نتیجتاً موضوع، ہیئت اور اسلوب بیان کے اعتبار سے افسانے کی صنف میں نت نئے اضافے ہوئے۔

آزادی کے فوراً بعد افسانوں میں فسادات پر لکھنے کا رجحان بہت شدت کے ساتھ عام ہوگیا۔ آزادی کے شیدائیوں کو ان ابتر حالات و واقعات کی مطلق توقع نہ تھی جن سے انھیں دو چار ہونا پڑا۔ انگریزوں نے ہندوستانی عوام کی جدوجہد آزادی کے آگے گھٹنے تو ضرور ٹیکے لیکن انھیں آزادی اس شکل میں دی کہ اول تو ملک کو تین حصوں میں توڑنے کی تحریکوں کو دل کھول کر پس پردہ تعاون دیا۔ دوسرے ہندو مسلم جو ایک دوسرے کے شریکِ غم و خوشی تھے، دونوں کو باہمی رنجش میں مبتلا کردیا۔ فرقہ واریت کے وہ بیج ان کے دلوں میں بو دیے کہ مدتوں تک ان کا اثر دلوں سے زائل نہ ہوسکے گا۔

تقسیم ہند نے ایک طرف مہاجرت کے المیہ کو پیدا کیا دوسری طرف فرقہ وارانہ فسادات کی بنیاد ڈالی۔ جس کے باعث عورتوں کے اغوا، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری کے دل دہلانے والے واقعات ظہور میں آئے۔ انگریز اپنے ساتھ ہندوستان کا بے پناہ خزانہ ساتھ لے گئے اور پھر تازہ ابتری کے نتیجے میں ملک کی معیشت کمزور ہوگئی۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ آزاد ملک نے جب اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو آزادی کا فائدہ اٹھا کر رشوت خوری نے دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹی۔ عوام کی خدمت کرنے والے ادارے خود عوام کی پریشانیوں کا

باعث بنے۔ ان تمام حالات کی عکاسی دہلی کے ان رسائل میں افسانوں کی شکل میں ملتی ہے جن کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ بیشتر افسانہ نگاروں نے مذکورہ صورت حال کو مختلف پہلوؤں میں دیکھا اور اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس طرح کے افسانوں کی تعداد دہلی کے ان ادبی رسائل میں خاصی ہے۔

آزادی سے قبل افسانے میں رومانوی رجحانات حاوی تھے۔ عشقیہ موضوعات کے علاوہ مثالیت پسندی بھی اردو افسانے کا لازمی عنصر تھی۔ لیکن آزادی کے بعد تبدیل شدہ سیاسی و سماجی حالات کے نتیجے میں ہمارے افسانے میں بھی کچھ اہم تبدیلیاں ہوئیں جن کی نمائندگی دہلی کے ادبی رسائل نے کی۔

آزادی کے بعد اردو افسانے میں پہلی تبدیلی تو خود آزادی کے احساس کی پیدا کردہ ہے۔ اظہار رائے کی آزادی کے نتیجے میں موضوعات کی قید ختم ہو گئی، لیکن اپنے اظہار کی مناسب راہ متعین نہ ہو تو صدیوں کی غلامی کے خوگر انسان بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً تخریبی کارروائیوں میں ملوث ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آزادیِ ہند کے نتیجے میں بھی ایسا ہوا۔

دوسری تبدیلی جس کو اہم کہا جاسکتا ہے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ اور نتیجتاً اس نظام اور معاشی وسائل سے متعلق اقدار اور افکار و نظریات کا متزلزل ہونا۔ اس تبدیلی نے قلمکاروں کے طبقے کو جو اس نظام کا پروردہ تھا، شدید ذہنی جھٹکا پہنچایا اور اس نے ادبی وسائلِ اظہار کو اختیار کر کے افسانوں کی شکل میں اپنے درد و کیف اور احساس محرومی کو پیش کیا۔

مہاجرت بھی ہمارے افسانے میں تبدیلی کا ایک اہم سبب بنی ہے۔ جن کی ترجمانی کسی حد تک دہلی کے رسائل میں بھی ملتی ہے۔ ہجرت پر مجبور انسانوں کو جب اپنے صدیوں کے بنائے ہوئے ماحول کو چھوڑ کر نئی جگہیں آباد کرنا پڑیں تو ایک زبردست احساس محرومی نے ان کے احساسات کو اذیتوں سے ہمکنار کرنا شروع کر دیا۔ یہ محرومیاں ایک طرف تو ان مادی وسائل کی تھیں جو ان سے اچانک چھن گئے تھے دوسری طرف تہذیبی اقدار سے جدا ہو جانے کی محرومی تھی۔ اس المیے سے دوچار ہونے والے افسانہ نگاروں کے یہاں ماضی کی بازیافت رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کا پتہ ہمیں دہلی کے رسائل سے بھی ملتا ہے۔

آزادی کے بعد اردو افسانے میں ایک رویہ وہ بھی متعارف ہوا جو نہ تو ماضی کے نہاں

خانوں میں جائے پناہ تلاش کرتا ہے اور نہ اس کی وکالت کو اپنا شعار بناتا ہے۔ بلکہ یہ رویہ ماضی و حال کے واقعات کی حقیقت پسندانہ انداز میں عکاسی کرتے ہوئے اقدار کی شکست و ریخت کو انسانی جذبات واحساسات کے آئینے میں جانچنے پرکھنے کا میلان رکھتا ہے۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعات کے جو عکس انسانی نفسیات اور قلبی کوائف پر مرتب ہوئے ان کا براہ راست اثر آرٹ اور ادب پر بھی ہوا۔ افسانہ جو کہ ادب کی نمائندہ صنف ہے ان اثرات سے بھلا کس طرح دور رہ سکتا تھا۔ لہٰذا افسانوی ادب کی جملہ اصناف میں ان تغیرات کی اثر پذیری واضح طور پر نظر آتی ہے۔ دہلی کے رسائل میں شائع ہونے والے افسانوں میں یہ رجحانات بآسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار جو آزادی سے قبل ادب میں اپنا مقام بناچکے تھے انھوں نے ان واقعات اور تبدیلیوں سے زبردست اثر قبول کیا اور مذکورہ بالا موضوعات پر فکر و تخیل کے جوہر دکھائے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب میں جس سماجی حقیقت نگاری کی روایت قائم کی تھی اس کو ان تازہ حالات نے کافی مقدار میں خام مواد فراہم کیا۔ جنگ کی لعنتیں، فرقہ وارانہ فسادات کی دی ہوئی روحانی و مادی ابتری، افلاس، بھوک، استحصال، جنسی بے راہ روی، توہم پرستی، فرسودہ رسم و رواج سرمایہ داری کی سازشی چالیں، انسانی جبلتوں کی کرشمہ سازیاں وغیرہ موضوعات نے ہمارے افسانے کو خاصا متاثر کیا۔

دہلی کے رسائل میں شامل افسانوں کی قابل ذکر تعداد اس صورت حال کے خلاف احتجاج پر مبنی ہے۔ احتجاج کا یہ رویہ بھی آزادی کے بعد اردو افسانے کا ایک نمایاں حصہ ہے۔

۱۹۶۰ء کے آتے آتے دہلی کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والے افسانوں میں یہ احتجاج ایک دوسرا روپ اختیار کرلیتا ہے۔ مغرب سے اٹھنے والے صنعتی انقلاب کے پیدا کردہ ماحول میں جس قسم کی سوسائٹی تشکیل ہوئی اس نے انسان کو ایک مشین کی حیثیت دے دی۔ اور اس طرح جذبوں کے فقدان نے اسے تنہائی کے صحرا میں بھٹکنے پر مجبور کردیا۔ سابقہ قدریں پامال ہوگئیں جن کی بنیاد انسان دوستی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے نظریے پر تھی۔ اب جو قدریں صنعتی ترقی کے باعث وجود میں آئیں ان میں ان چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ صنعتی سماج میں انسان کا واحد نصب العین ہر طرح کی ظلم و زیادتی کو روا رکھ کر مادی آسائشیں حاصل کرنا رہ گیا۔ انسان کے مقام و مرتبے کا تعین چوں کہ شرافت نفس اور اعلیٰ اخلاق کے

بجائے مادی ترقی سے ہونے لگا، جس شخص کے پاس جتنی زیادہ دولت اور آسائش کی چیزیں ہوں گی وہ اتنا ہی شریف اور اعلیٰ مرتبے کا مالک قرار پائے گا۔ ان حالات میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ انسان کی تمام زندگی مادی ترقیوں اور دولت کے حصول میں صرف ہو۔ خواہ وہ دولت کتنی ہی گردنیں کاٹ کر حاصل کی جائے۔ خواہ اس کے حاصل کرنے میں اسے اپنے ضمیر کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹنا پڑے۔ اس صورت حال کے خلاف احتجاج کی جو آواز افسانے میں اٹھی اسے جدیدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ جدیدیت نے ان موضوعات کو سب سے زیادہ برتا۔ اس رجحان نے علامتی پیرایۂ اظہار کو بھی فروغ دیا۔ خوف، تشکیک، تنہائی کی کیفیات جو اس سماج کے انسان کا مقدر بنی، کا اظہار افسانوں میں ہونے لگا۔ اس طرح کے افسانوں کو "تلاش" "تخلیق" "سطور" "محور" "معیار" اور "شعور" وغیرہ رسائل نے زیادہ فروغ دیا۔ اس نئے اسلوب میں لکھنے والوں میں بلراج مین را۔ سریندر پرکاش، الیاس احمد گدی، احمد ہمیش، انور سجاد، انور عظیم، دیویندر اسر، سلام بن رزاق عبدالصمد، شفق وغیرہ اہم ہیں۔

اس کے علاوہ ان رسائل کے مطالعے سے یہ بھی حقیقت سامنے آئی ہے کہ اکثر ماحول اور وقت کے مطابق ان رسائل نے افسانے کو اپنے صفحات پر جگہ دی ہے۔ لحظہ لحظہ بدلتے ہوئے ملک کے سیاسی، سماجی، اور تہذیبی حالات کی پرچھائیاں ان رسائل کے افسانوں میں صاف نظر آتی ہیں۔ ذیل میں دہلی کے ان ادبی رسائل میں شامل افسانوی تخلیقات کا جائزہ پیش ہے۔

۱۔ "آج کل"

"آج کل" کے آزادی کے بعد دوبارہ شروع ہوتے ہی اس میں ہمعصری رجحانات کا پرتو پڑنے لگتا ہے۔ اس رسالے میں جو افسانے اور ناول وغیرہ شائع ہوئے۔ ان کو کسی ایک نظریے یا رجحان کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ سرکاری جریدہ ہونے کی وجہ سے اس کی کسی ایک نظریے یا رجحان سے وابستگی ممکن نہ تھی۔ البتہ جوش ملیح آبادی (ایڈیٹر) کے ترقی پسند ہونے کی وجہ سے سماجی حقیقت نگاری پر مبنی مواد زیادہ شائع ہوا۔ وطن کی محبت اور آزادی کی جدوجہد پر روشنی ڈالنے والے افسانے بھی اس میں شائع ہوتے اور روایتی عشقیہ موضوعات

پر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی راہ میں درپیش پیچ در پیچ مسائل کا احاطہ بھی اس کے افسانوں میں کیا جاتا رہا۔ انسانی نفسیات کی گتھیاں بھی سلجھائی گئیں اور فرسودہ نظام معاشرت پر انگلی بھی اٹھائی گئی۔ "آج کل" کے مدیروں کی تبدیلی کے ساتھ اس کے مشمولات کے مزاج میں بھی کسی حد تک تبدیلی ہوتی رہی۔ اس رسالے کے افسانہ نگاروں میں ذیل کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں :

قرۃ العین حیدر۔ خواجہ احمد عباس۔ کرتار سنگھ دگل۔ عفت موہانی۔ ٹیگور، شرون کمار، یوسف اشفاق، سلام مچھلی شہری، کوثر چاندپوری، کرشن چندر، رام لال، آمنہ ابوالحسن، افسر آذر، جوگیندر پال، اقبال متین، ذکی انور، واجدہ تبسم، صالح عابد حسین، جیلانی بانو، سریندر پرکاش، پریم ناتھ درد، ابراہیم یوسف، صغریٰ مہدی، قاضی عبدالستار، سلام بن رزاق، کلام حیدری، علی محمد لون، محمد یوسف، انور عظیم، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، م۔ م۔ راجندر، گوربخش سنگھ، رتن سنگھ، مشتاق احمد، شکیلہ اختر، شمیم سیفی، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، م۔ ک۔ مہتاب، رضیہ سجاد ظہیر، بانو سرتاج، قمر الحسن، عابد سہیل، موہن لال، عطیہ پروین، عفت آرا، عمر مجید، ذکیہ مشہدی، حیات اللہ انصاری، کنور سین، شین مظفرپوری، دیویندر ستیارتھی، آصفہ مجیب، اکرام فاروقی، رام پال، ان افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں مختلف اسالیب اور طرز فکر کی نمائندگی کی ہے۔ ذیل میں چند افسانوں کا تعارف ملاحظہ کیجئے :

دسمبر ۱۹۴۷ء "اور وہ دلہن" یوسف اشفاق، ص۔۴۶

اس افسانے کی کہانی ایک مظلوم لڑکی، ایک لڑکے اور سوتیلے والدین کے گرد بنی گئی ہے۔ کہانی میں بعض رشتوں کی خوفناکی و خودغرضی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ایک سوتیلی ماں اپنے بیٹے کی محبوب بیوی کو اس لیے زہر دے کر قتل کردیتی ہے کہ وہ ان کی نوکر تھی اور اس سے اس کے سوتیلے بیٹے نے خفیہ طور پر شادی کرلی تھی جو کہ ان کی شان کے خلاف تھا۔ دوسری شادی ان کے خاندانی معیار کے مطابق کی گئی لیکن لڑکا اپنی مرحوم دلہن کو بھلا نہیں پاتا ہے۔

کہانی کی زبان آسان اور سادہ ہے۔ بیانیہ اسلوب میں کہانی لکھی گئی ہے جس میں سماجی حقیقت نگاری کا حق ادا کردیا گیا ہے۔

دسمبر ۱۹۴۷ء "گمنام فنکار" سلام مچھلی شہری ص۔۴۰

مکالمے کے انداز میں مختلف اصناف کے وسیلے سے مصنف نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار منظر اپنے مرحوم والد کی کچھ غیر مطبوعہ تحریریں ایک رسالے کے اڈیٹر کو دکھانے کے لیے جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے اڈیٹر ان تحریروں کو دیکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ منظر متن پڑھ کر سناتا ہے۔ ایک اسکرپٹ سن کر اڈیٹر کی دلچسپی بڑھتی ہے اور وہ منظر سے مزید مسودوں کو سننے کی فرمائش کرتا ہے۔ منظر یکے بعد دیگرے شاعری 'اسٹیج ڈرامے' گیت اور نغمے وغیرہ سناتا ہے جن میں غربت' اخلاق' سماجی حقائق' نوجوانوں کی نفسیات وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عام لیکن دلکش اسلوب میں سماج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

ستمبر ۱۹۵۰ء ''شاہی'' کرتار سنگھ دگل' ص-۳۸

اس افسانے میں دیہی زندگی کی عکاسی بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔ نچلے طبقے کی نفسیات' غربت وافلاس' آرزوؤں اور تمناؤں کی پرچھائیاں اس کہانی میں رقص کناں ہیں۔

شاہی ایک غریب عورت کی کہانی ہے۔ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی جس کے عاشقوں کی فہرست بہت لمبی ہے اور جس کا حسن کئی بار خون خرابے کا سبب بن چکا ہے۔ بڑے بڑے امیروں کو جوتے کی نوک پر مار دیتی ہے اور ان کا پیغامِ نکاح ٹھکرا دیتی ہے۔ آخر عین شباب میں پاگل ہو جاتی ہے اور عمر عزیز کے تیس سال پاگل خانے میں گزار دیتی ہے اور جب صحت یاب ہو کر باہر آتی ہے تو اس کی خوں خوار طبیعت میں مسکینی پیدا ہو جاتی ہے۔ بستی میں گھوم پھر کر روزی کماتی ہے۔ کھیتوں سے ساگ وغیرہ لا کر بیچتی ہے' گھروں کے کام کرتی ہے۔ لوگ اس کے بدن پر لٹکتے ہوئے چیتھڑوں کو دیکھ کر اسے کپڑے دے دیا کرتے ہیں تو وہ انھیں پہنتی نہیں بلکہ فروخت کر دیتی ہے۔ بعض اوقات وہ لوگوں کی چیزیں چُرا بھی لیتی ہے اور انھیں بیچ دیتی ہے۔

ایک دن راوی اسے روٹیاں اور کپڑے بیچتے ہوئے دیکھ لیتا ہے اور اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاہی بہت پیسے والی ہے۔ اتفاق سے جب دوسرے دن شاہی راوی کے گھر بیر بیچنے کی غرض سے آتی ہے تو راوی یہ کہہ کر کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ شاہی نے گھر میں پیسوں کا ڈول دبا رکھا ہے اور یہ خواب صبح کے وقت دیکھا ہے' صبح کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا' شاہی سے راز اگلوا لیتا ہے۔ شاہی اسے بتاتی ہے کہ جوانی میں اسے ایک نیچ ذات کے نوجوان مادھو سے محبت ہو گئی تھی جس نے ڈر کی وجہ سے اس سے نکاح نہیں کیا اور

ایک دوسری لڑکی سے شادی کرلی۔ اس غم میں شاہی پاگل ہوگئی۔ تیس سال کے بعد جب وہ پاگل خانے سے باہر آئی تو مادھو کی بیوی کاشاں مرچکی تھی۔ اس کے بعد مادھو نے کئی نکاح کیے لیکن کوئی بیوی زندہ نہیں رہی۔ ایک دن شاہی نے اس سے کہا کہ میری جوانی تو نے برباد کی لیکن بڑھاپے کو مت برباد کر۔ ہماری محبت ازلی ہے۔ اب مجھے اپنے نکاح میں لے تاکہ عافیت بخیر ہوسکے۔ مادھو اس سے ایک سو بیس روپے لانے کو کہتا ہے اس رقم کو جمع کرنے کے لئے شاہی یہ راستہ اختیار کرتی ہے۔ اب تک اس کے پاس ایک سو پندرہ رپے ہوگئے تھے۔ راوی اس کو پانچ روپے دے کر رقم پوری کردیتا ہے اور شاہی دوسرے دن دلہن بن کر مادھو کے گھر کی طرف روانہ ہوجاتی ہے۔

کہانی میں جذبۂ محبت کا یہ منظر ایک گہرا نقش قاری کے دل پر چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہات کی پسماندہ زندگی کی جزئیات بھی اس کہانی میں ہمیں ملتی ہے۔ جو حقیقت نگاری میں معاون ہوتی ہے۔

مئی ۱۹۷۳ء "بیچوں بیچ" جوگیندر پال

واحد متکلم کی زبان میں افسانہ بیان کیا گیا ہے۔ راوی ایک بنگلے کو خریدنے کی غرض سے دیکھنے جاتا ہے تو اس کا دروازہ ایک خوبصورت لڑکی کھولتی ہے۔ راوی اس کے پیچھے راہداری سے گزرتا ہے اراس کے بے پناہ حسن کے طلسم میں کھو جاتا ہے۔ ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ کر اس کو دادی ماں کی سنائی ہوئی اپسرا کی کہانی اور اس کا طلسماتی ماحول یاد آجاتا ہے۔ گویا وہ نوجوان لڑکی اپسرا اور وہ خود آدمی زاد ہے جس پر عاشق ہو کر اپسرا اس کے محل میں آگئی تھی۔ راوی اپنے ذہن کو اس محل سے تعبیر کرتا ہے۔ اس نوجوان عورت کو اپنانے کی خواہش بے طرح اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ بظاہر وہ بنگلے کا سودا کر رہا ہے لیکن دل میں دبی ہوئی خواہش اس عورت سے تصور میں ہمکلام ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل کی بات حسینہ کے روبرو پیش کردیتا ہے۔ حسینہ اس کی بات مان لیتی ہے۔ وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے اور بنگلے کے سارے درخت اور پرندے ان کے گرد آکر رقص کرنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر وہ چونک پڑتا ہے اور خود کو صوفے پر بیٹھا ہوا پاتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ کچھ بھی ہو دوشیزہ کو اپنا بنا کر ہی دم لے گا۔ قیمت میں اپنا آپ بھی اسے سونپ کر۔

جنوری ۱۹۷۳ء "مدار" اقبال متین

عنفوان شباب کی منزل میں راوی کو ایک ہم عمر لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ دونوں زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے۔ لڑکی کی شادی دوسری جگہ کر دی جاتی ہے۔ راوی کے والد کا دوسرے شہر میں تبادلہ ہو جاتا ہے اور شادی کے بعد راوی کی بیوی حاملہ ہوتی ہے تو اسے اپنی محبوبہ کا حمل یاد آتا ہے۔ ایک بار میلے میں گھومتے ہوئے راوی کو اس کی محبوبہ دکان پر مل جاتی ہے۔ جس کے ساتھ اس کا وہ لڑکا بھی ہے جو زنا کے نتیجے میں راوی کے نطفے سے پیدا ہوا تھا۔ لیکن شادی کے بعد لڑکی کا جائز بچہ سمجھا گیا۔ اس میں راوی کے چہرے کی مشابہت پائی جاتی تھی۔ راوی نے اپنی بیوی سے راحت (محبوبہ) کا تعارف کرایا۔ واپسی میں راوی کی بیوی کہتی ہے کہ کتنا پیارا بچہ ہے۔ تمہاری بچپن کی تصویر کی طرح۔ راوی اندر ہی اندر بوکھلا اٹھتا ہے۔ پیچھے مڑ کر بچے کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا۔ راوی سوچتا ہے کہ اگر وہ بچہ اسے ابا کہہ کر پکار بھی لیتا تو کیا وہ اس کے لیے ٹھہر سکتا تھا۔ محبوبہ سے زنا کی یاد اس کے دل میں اس طرح چھپی رہتی ہے جیسے کسی مداری کی پٹاری میں ناگن۔ کبھی کبھی ناگن پٹاری سے جس طرح اپنا پھن نکال لیتی ہے۔ بیوی کی بات سے راوی کو ایسا لگا گویا وہ اس کے دل کی پٹاری میں چھپی راحت کی یاد کی ناگن کو کھول رہی ہے اور وہ جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام رہا ہو کہ اس میں ناگن ہے ڈس لے گی۔ لیکن پٹاری کھلی تو خالی تھی۔ یعنی اب وہ خود احتسابی کے احساس سے نجات پا چکا تھا۔

مئی ۱۹۷۳ء "ڈھکوسلہ" عصمت چغتائی۔

یہ کہانی تعلیمی صورت حال پر ناقدانہ تبصرہ ہے۔ راویہ فلیٹ جے ہند کالج کے سامنے گیٹ پر طلبہ وطالبات کا ہجوم دیکھتی ہے۔ داخلوں کا موسم ہے۔ راویہ سوچتی ہے کہ کن کن مشقتوں سے بچے اسکول کی تعلیم پاس کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج میں داخلے کے لیے آتے ہیں۔ داخلے ہو جاتے ہیں تو پھر راویہ بتاتی ہے کہ یہ امیر باپوں کے بچے سارا وقت سینما دیکھنے' گپ بازی کرنے اور فلموں پر تبصرہ کرنے اور ایکٹر ایکٹریوں کی طرح خود کو بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ صرف ڈگریاں ضروری ہیں علم بے کار ہے کیوں کہ نوکری کے لیے ڈگریاں چاہئیں علم نہیں۔ سفارشوں سے سارا کام چلتا ہے۔ رشوت ہر کام کا کرا دیتی ہے۔ لڑکیاں بھی گھر پر دولہا کا انتظار کرنے کی بجائے کالج میں تفریح کرنے کے لیے داخلہ لے لیتی ہیں۔ کسی سے محبت ہو گئی ماں باپ نے شادی کر دی۔ غریب اور بدصورت

لڑکیاں ہی علم حاصل کرتی ہیں کیوں کہ ان سے شادی کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لیے پڑھ لکھ کر استانیاں بن جاتی ہیں۔ اور ویسے کال گرل کے پیشے میں بھی اچھی کمائی ہے۔ بد صورت ہوں تو کیا ہوا بس ذرا جسم اچھا ہونا چاہئے۔ راویہ ایک دن گھر آئے ہوئے ان بچوں سے پوچھتی ہے تو وہ بتاتے ہیں کہ وہ کانوینٹ ایجو کیسٹڈ ہیں اس لیے صرف انگلش جانتے ہیں اور اسی کی رعب سے نوکری مل جاتی ہے کیوں کہ حکومت کے سارے کام انگلش میں ہوتے ہیں۔ سرکاری زبان تو بس ڈھکوسلہ ہے۔

عصمت چغتائی کے اس افسانے میں آج تعلیمی ماحول اور سرکاری محکموں کی تقرری ملازمین پر بھرپور طنز ہے۔ افسانے کی زبان اور طرز اظہار نہایت اثر انگیز ہے۔ اس افسانے کے علاوہ "آج کل" میں عصمت کی متعدد افسانوی نگارشات شامل ہیں جن میں ایک قسط وار ناول "کاغذی ہے پیرہن" کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

مئی ۱۹۷۹ء "فرشتوں کی بارات" م۔ م۔ راجیندر ص ۳۷

اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان محنت کرے تو اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی جس طرح گاؤں کے ایک معزز شخص قاضی صاحب نے پورے گاؤں کو محنت کی راہ پر ڈال کر پورے گاؤں کے لوگوں کی زندگی میں خوشیوں کی لہر دوڑادی۔ بارش سے کھیتوں اور مکانوں کو پہنچنے والے نقصانات سے قاضی صاحب نے گاؤں والوں کو اس طرح نجات دلائی کہ سب کو اپنے ساتھ ملا کر پتھروں کا ایک باندھ تعمیر کردیا۔ اصلاحی انداز کی یہ کہانی اپنے انداز میں بھرپور تاثر رکھتی ہے۔

فروری ۱۹۷۹ء "اندھیرا اجالا" سہیل عظیم آبادی

اس کہانی میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوستانی قوم پر مغربی تہذیب کے اثرات بہت زیادہ مرتب ہو رہے ہیں۔ اس لیے پوری قوم اندھیرے کی طرف جارہی ہے۔ نسیم ایک ویران ہوٹل میں جایا کرتا ہے مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ ہوٹل کافی آباد ہوجاتا ہے اور اس میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ وہ سوچتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ داخل ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہوٹل میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ لیکن وہاں بھیڑ کافی ہے۔ نسیم سوچتا ہے کہ جب یہاں روشنی تھی تب کوئی گاہک نہیں آتا تھا اور اب اندھیرا ہونے پر سب آتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۰ء "پل" رام لعل ص ۳۸

اس کہانی میں ایک ایسے گھر کو موضوع بنایا گیا ہے جہاں عورت اور مرد کے جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور ان جھگڑوں سے سمجھ دار بچے خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن ایک شخص ایسا بھی ہوتا ہے جو ان کے بیچ کے جھگڑے نپٹانے میں ہمیشہ کام آتا ہے۔ وہ اس گھر سے محبت رکھتا ہے اور ایک پل کا کام کرتا ہے۔

ستمبر ۱۹۸۴ء "رونے کی آواز" غیاث احمد گدی ۳۲

علامتی طرز میں لکھی گئی اس کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صنعتی دور کی اس زندگی میں فنون لطیفہ کے ماہرین نے اپنے فن کو پیٹ پالنے کا ذریعہ محض بنالیا ہے اور اس تجارتی نکتہ نظر نے فن کے قدردانوں کو ناپید کردیا ہے۔ راوی کو بس اسٹاپ پر ایک شخص پہچان کر اسے گزشتہ زندگی کی یاد دلاتا ہے لیکن راوی کو کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ اجنبی راوی کو بتاتا ہے کہ وہ اس کے گاؤں کا باشندہ ہے۔ راوی بہت اچھا ستار نواز تھا۔ اس کی ستار نوازی پر مگدھ ہو کر لاجو اپنی سدبدھ کھو کر اپنے شوہر کی سیج سے اٹھ کر راوی کے قدموں پر بیہوش ہو جاتی ہے۔ لاجو کا شوہر اور خسر ڈھونڈتے ہوئے وہاں آجاتے ہیں۔ شوہر بتاتا ہے کہ کئی بار وہ اس کے ساتھ لیٹے ہوئے کھو سی جاتی تھی۔ اور پوچھنے پر بتاتی تھی کہ وہ اندر لوک میں پہنچ جاتی ہے اس پر اس کا خسر اسے دیوی قرار دے کر چھوڑ دیتا ہے اور راوی سے اس کا بیاہ کردیا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں راوی کو یاد نہیں۔ اجنبی پوچھتا ہے وہ ستار کہاں گیا۔ بہت یاد کرنے پر وہ بتاتا ہے کہ کاروبار کے لیے پیسے چاہئے تھے لہٰذا فروخت کردیا۔ کہاں فروخت کیا؟ یاد آتا ہے جب جی بی روڈ سے وہ گزرتا ہے تو سازو نغمہ کی آواز یوں سنائی دیتی ہے گویا کوئی بین کر رہا ہو۔ اور لاجو۔ اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں آرہا۔۔۔۔ فن کی ناقدری کی علامت کے طور پر یہ کہانی قاری پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

نومبر ۱۹۹۱ء "شکنجہ" شوکت حیات ۴۱

چائلڈ لیبر کو موضوع بنا کر لکھی گئی اس کہانی میں کمسنی میں افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر محنت مزدوری کرنے والے بچوں کے تئیں جذبہ ہمدردی ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ریل کے ڈبے میں قلی کے بچے کو دیکھ کر جو اپنے باپ سے تہوار کے موقع پر گھر جانے کی ضد کرتا ہے، ایک مسافر کے اوپر گہرا اثر پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس کا باپ اسے اس لیے گاؤں جانے کی اجازت نہیں دیتا کہ شہر میں رہ کر محنت مزدوری کر کے پیسہ کمائے گا۔ مسافر پر اتنا شدید اثر

اس واقع کا مرتب ہوتا ہے کہ وہ "میرا بچہ میرا بچہ" کہہ کر چیخ پڑتا ہے جب کہ اس کا بچہ اس کے قریب برتھ پر بیٹھا ہوا ہے۔

کہانی مقصدی پہلو رکھتی ہے لیکن اپنے اسلوب کی دلکشی کی وجہ سے اس کا جمالیاتی حق مجروح نہیں ہوا ہے۔

مذکورہ مثالوں سے یہ بات واضح ہے کہ "آج کل" میں جو افسانے شائع ہوئے ان میں اسلوب اور موضوعات کی سطح پر تجربہ پسندی اور روایت پسندی کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ سلام مچھلی شہری کا افسانہ "گمنام فنکار" ایک نیا تجربہ ہے جس میں دو شخصوں کے مکالموں کی مدد سے کہانی بیان کی گئی ہے۔ علامتی پیرایہ اظہار بھی "آج کل" کے بیشتر افسانوں میں ملتا ہے۔ غیاث احمد گدی کا افسانہ "رونے کی آواز اس کی بہترین مثال ہے۔ بہت سے افسانے خالص بیانیہ اسلوب رکھتے ہیں جب کہ اکثر واحد متکلم کی زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح کے افسانوں میں کہیں تو افسانہ نگار خود افسانے کا ایک کردار ہوتا ہے یا کوی اور کردار اپنی سرگزشت بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں روزمرہ کی زندگی کے تجربات سے لے کر سیاسی و سماجی صورت حال تک کی عکاسی بڑے کامیاب انداز میں کی گئی ہے۔ "آج کل" کے افسانوں کی عمومی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ ان کی زبان دقیق الفاظ سے بوجھل نہیں۔ تشبیہات و استعارات بھی اچھوتے استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض افسانے اساطیری حوالوں کی مدد سے بھی تخلیق کیے گئے ہیں۔ ایسے افسانے بھی "آج کل" کی زینت بنے ہیں جو حکومت کی طرف سے چلائی گئی مہموں کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً شوکت صدیقی کا "شکنجہ" جو کہ محنت اطفال جیسی لعنت کے خلاف قاری کو آمادہ کرتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم زیادہ مثالیں پیش نہیں کر سکے ہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی اصول سامنے رکھا گیا ہے۔ ہاں مختلف اسالیب اور موضوعات کی نمائندگی کے لیے مختلف ادوار کے افسانے خواہ وہ کسی افسانہ نگار کے ہوں۔ چن لیے گئے ہیں۔ ویسے یہ مثالیں ناکافی ہیں۔ ذیل میں چند اور افسانوں کے صرف عنوان دیئے جاتے ہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ اس جریدے میں کس سطح کے قلمکاروں کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔

"آبشار"	بلونت سنگھ	مارچ ۱۹۵۵ء
"آتش خاموش"	علی عباس حسینی	اگست ۱۹۵۳ء

آخری مجنوں	لوچن بخشی	فروری ۱۹۷۸ء
آسمان بنانے والے	کرشن چندر	اگست ۱۹۵۴ء
اب نہیں	عطیہ پروین	نومبر ۱۹۷۶ء
ا. بھیشاپ	بلراج ورما	ستمبر ۱۹۸۶ء
اجنبی	علی باقر	مارچ ۱۹۷۹ء
اماں جان	کوثر چاندپوری	مئی ۱۹۵۹ء
انجام کار	سلام بن رازق	اگست ۱۹۷۴ء
اندر کا ڈر	اقبال مجید	جولائی ۱۹۷۲ء
اے دیدہ ورو (ناول)	جوگیندر پال	جولائی ۸ تا اکتوبر ۸۲ء
بارش، وہ اور میں	انجم عثمانی	فروری ۱۹۷۹ء
بڑے چھوٹے	واجدہ تبسم	اکتوبر ۱۹۶۱ء
بس اسٹاپ	بلراج مین را	مئی ۱۹۶۴ء
رائل	ذکیہ مشہدی	فروری ۱۹۸۱ء
پڑاو	ہنس راج رہبر	مارچ ۱۹۷۸ء
پندار	راجندر سنگھ بیدی	ستمبر ۱۹۴۸ء
پہچان	رضیہ سجاد ظہیر	مارچ ۱۹۵۲ء
پھر زخم مہک اٹھا	باقر مہدی	اپریل ۱۹۵۰ء
پیش لفظ	حیات اللہ انصاری	اگست ۱۹۸۶
تاریک گوشے	محمد حسن	دسمبر ۱۹۴۸ء
تماشہ	ذکی انور	جون ۱۹۵۱
چراغ روشن ہیں	عصمت چغتائی	دسمبر ۱۹۷۷ء
خلائی قاصد	رفیعہ منظور الدین	جون ۱۹۶۸ء
زمین کا درد	اقبال متین	مارچ ۱۹۷۸ء
ساحل طوفان اور تماشہ	ہرچرن چاولہ	جنوری ۱۹۶۷ء
سامنا	انور عظیم	مارچ ۱۹۷۱ء

سایہ	بلراج کومل	جنوری ۱۹۷۰ء
سنیچر شاہ	شفیع مشہدی	ستمبر ۱۹۸۲ء
کار جہاں دراز ہے (ناول مسلسل)	قرۃ العین حیدر	ستمبر ۱۹۷۲ء
کاغذی ہے پیرہن (مسلسل ناول)	عصمت چغتائی	مارچ ۷۹ء تا مئی ۱۹۸۰ء
کنواری	کرشن چندر	اگست ۱۹۶۴ء
مردہ آدمی کی تصویر	سریندر پرکاش	اگست ۱۹۷۷ء
نازو	قاضی عبدالستار	اگست ۱۹۷۰ء
خودکشی	سرلا دیوی	اکتوبر ۱۹۵۸ء
رگِ سنگ	رتن سنگھ	مارچ ۱۹۷۶ء
روشنی	ستیش بترا	دسمبر ۱۹۵۹ء
نیل یکشنی	دیویندر ستیارتھی	مئی ۱۹۸۲ء
ودیا نگر کی مسجد	شین مظفرپوری	جولائی ۱۹۸۳ء
خوشبو بن کے لوٹیں گے	دیویندر اسّر	نومبر ۱۹۵۸ء
میں ہوں	نریندر لوتھر	مارچ ۱۹۶۴ء
تلاش ایک بالی کی	رتن سنگھ	نومبر ۱۹۹۱ء

مندرجہ بالا فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مکتبہ ادب سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں نے "آج کل" میں اپنی نگارشات شائع کرائیں۔ اور اس جریدے کو موضوع ہیئت اور اسلوب کی سطح پر تنوع بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جریدے کی ریڈرشپ دیگر ادبی جرائد کی نسبت زیادہ ہے۔ اس رسالے میں خالص تجریدی افسانے جن میں ابہام اہمال کی سطح تک پہنچ جاتا ہے بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ بعض افسانے ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں سے ترجمہ بھی کیے گئے ہیں لیکن یہاں ان کا ذکر ضروری نہیں۔

"شاہراہ"

اس ماہنامے میں شائع ہونے والے افسانوں میں غالب رجحان سماجی حقیقت نگاری کا ہے جن میں نچلے اور نچلے متوسط طبقے کی زندگی کی جزئیات کو موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔

ان افسانوں کو پڑھ کر کسی بھی حساس دل میں ان انسانوں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو مدت مدید سے سرمایہ داروں کے استحصال کی چکی میں پستے آرہے ہیں اور جن کی آرزوئیں ان کی مکروہ مفلسی کی کیچڑ میں دفن ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو جاتی ہیں۔ سماجی نفسیات کے بہترین مرقعے ان افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً کرشن چندر کا افسانہ ''مہا لکشمی کا پل'' (شمارہ ا جلد ا) میں ایک ہی محلے کی چالوں میں رہنے والی مختلف عورتوں کی زندگیوں پر اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ قاری کو بظاہر کریہہ المنظر دکھائی دینے والے افلاس زدہ سماج کے تئیں جذبہ ہمدردی پیدا ہو جاتا ہے۔ نیز ان کرداروں کی نفسیات کے پردے یکے بعد دیگرے اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا ترجمان ہونے کی وجہ سے اس جریدے کا افسانوی ادب جدید سائنٹی فک بنیادوں پر قائم ہونے والے معاشرے کے قیام کا مبلغ نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں جو موضوعات برتے گئے ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر ابتدائی صفحات میں کیا گیا ہے۔ ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جن میں محبت کی روایتی قدروں کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ان میں انسان کے جبلی تقاضوں کے احترام کا جذبہ ملتا ہے۔ فرسودہ مذہبی رسوم پر طنز و تنقید کے نشتر بھی ان افسانوں میں خوب چلائے گئے ہیں۔ آزادی اور پھر تقسیم کے پیدا کردہ موضوعات پر بھی ''شاہراہ'' میں کافی افسانے لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ ایسے افسانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جن میں محض واقعہ نگاری کو مطمح نظر بنایا گیا ہے۔ واقعہ نگاری کے اس رجحان نے اکثر تصانیف میں صحافتی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے ان تحریروں میں نقص ہوتے ہوئے بھی اس لیے قابل تعریف ہیں کہ ان میں انسان کی عظمت اور دوستی پر زور دیا گیا ہے۔ ایسے افسانوں کی تعداد بھی کم نہیں جو ہیئت، تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے بھی کافی دلکش ہیں۔ اور قاری کے ذہن پر ایک انمٹ نقش چھوڑتے ہیں۔

فسادات پر جن قلمکاروں نے زیادہ افسانے لکھے ہیں ان میں کرشن چندر کا نام نمایاں ہے۔ ''مہالکشمی کا پل'' اوپر مذکور ہوا، اس کے علاوہ دہلی کے دائرے (جلد شمارہ) میں کرشن چندر نے رفیوجی کیمپ کی بدعنوانیوں کا بیان کیا ہے۔ جہاں بھلا سبھائیں ہیں جو ان پناہ گزینوں کی مدد کرنے کا جتن کر رہی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ رشوت ستانی بھی ہے، حکام کی بے حسی اور بدعنوانی بھی۔ اسی طرح فکر تونسوی کے افسانے اغوا شدہ عورتیں (جلد ا شمارہ) اور واگھہ کی سرحد (جلد شمارہ) میں واقعاتی رنگ نمایاں ہے۔ پناہ گزینوں کی تباہ حالی پر اوپندر ناتھ اشک کا

"ٹیبل لینڈ" (Table Land) بھی قابل ذکر افسانہ ہے۔ تکنیک اور فن کے اعتبار سے ان افسانوں میں کمزوریاں بھی ہیں۔ انداز بھی بیشتر صحافتی ہے مگر وہی بات کہ ہنگامی حالات میں یہ تخلیقات بڑی تخلیقات تھیں۔ بقول محمد ذاکر "یہ ہمارے افسانہ نگار کی دردمندی اور انسان دوستی کا ثبوت ہیں اور ان میں اس دور کی دردناک تصویریں ہیں۔ اور اس طرح عبرت کا سامان محفوظ ہو گیا۔"

عصمت نے "جڑیں" (جلد شمارہ) میں اس طرح ان قدروں کی طرف فنکارانہ انداز میں توجہ دلائی ہے جو اس گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد بنی تھی اور جو ہندو اور مسلمانوں کے ہندوستان میں صدیوں کے اختلاط سے قائم ہوئی تھی۔ جب ہندوستان آزاد ہوا اور خود غرضی نے اس کے ٹکڑے کرائے تو ایک فرقے کا وطن ترک کرنا اپنی جڑیں کاٹنے کے مترادف تھا اور لوگ خوشی خوشی امید موہوم پر یہ کر رہے تھے۔ اس پس منظر میں ہجرت کرتے ہوئے ایک مسلمان خاندان کو اس کے پرانے ہندو پڑوسی روپ چند نے اپنی جڑیں کاٹنے سے روکا۔ عصمت نے بظاہر ایک معمولی سے واقعے کو نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول ممتاز شیریں "یہ افسانہ زندگی سے کاٹا گیا ہے۔ ایک متوسط مسلمان گھر کی جیتی جاگتی تصویر.... ان کا جاندار فن اور زبان' وہ مکالمے جو عصمت چغتائی ہی لکھ سکتی ہیں۔"

"جاگتے رہو" خواجہ احمد عباس (جلد ا شمارہ ۲) ایک لالچی اور بخیل شخص کی زندگی پر مشتمل بڑا دلچسپ افسانہ ہے۔ جس میں انسان کی ذلت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

دیویندر ستیارتھی کا افسانہ "جنم بھومی" (جلد اش ۳-۴) حب الوطنی کے جذبے سے سرشار رہنے والے افراد اور تقسیم ہند سے پیدا شدہ بحران پر عمدہ کہانی پیش کرتا ہے۔

"وسیلہ" ملک راج آنند (جلد ۶ شمارہ ۱-۲) پلیٹ فارم پر زندگی بسر کرنے والوں کی زندگی بسر کرنے والوں پر کامیاب افسانہ ہے۔ جس میں جزئیات نگاری پر خاص زور ملتا ہے۔

"واپسی" ٹھاکر پونچھی (جلد ۶ شمارہ ۳) ایک عورت کی کہانی ہے جو پردیس گئے ہوئے اپنے شوہر کا انتہائی صبر کے ساتھ انتظار کرتی ہے اور اپنی عصمت پر آنچ نہیں آنے دیتی ہے۔

"ہالہ" زہرہ جمال (جلد ۱۰ شمارہ ۱) تقسیم ہند کی بدولت برباد ہو جانے والے ایک خاندان کی کہانی ہے۔ جس میں نے محنت سے دوبارہ اپنے خاندان کو آباد کیا۔

"بوڑھا انکل" غیاث احمد گدی (جلد ۱۰ شمارہ ۱) بے سہارا بچوں کی پرورش کرنے والے

ایک بزرگ شخص کے خلوص اور محبت کی کہانی ہے۔

"ماں بیٹے" واجدہ تبسم (جلد ۱۲ شمارہ ۳) ماں کے حقوق تلف کرنے والے بیٹے کی زندگی پر مشتمل کہانی ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ "شاہراہ" میں چھپنے والے افسانوں کے موضوعات خارجی زندگی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جن کا مقصد انسان کے اندر اعلیٰ اخلاقی قدروں کو ابھارنا ہے۔ سماج اور زندگی کی مکروہ تصویریں پیش کرکے ان کی اصلاح کا جذبہ پیدا کرنا اور پسماندہ عوام کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کا حوصلہ پیدا کرنا ان افسانوں کا خاص مقصد ہے۔ بعض افسانوں میں موضوعات گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیے گئے ہیں اور بعض فرسودہ رسوم و توہمات سے پیدا ہونے والے نقصانات کو اجاگر کرنے والے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان افسانوں کا اسلوب عام روش سے ہٹا ہوا بھی ہے اور روایتی بیانیہ میں بھی اکثر افسانے لکھے گئے ہیں۔ بعض میں واقعات کے پیچھے کارفرما عوامل کا تجزیہ ملتا ہے تو بیشتر افسانے ایسے بھی ہیں جن میں سطحیت کے ساتھ محض واقعہ بیان کرنے ہی کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ عصری زندگی کی ترجمانی ان افسانوں کا اہم وصف ہے۔ زبان اور انداز بیان بھی بعض افسانوں کا انتہائی جاندار ہے۔ کہیں کہیں جنسی لفظیات کا سہارا لے کر تلذذ پیدا کرنے کی بھی کوشش ملتی ہے ایسی کہانیوں میں منٹو کے افسانے کی نقل کرنے کی کوشش کا پرتو نظر آتا ہے مگر کامیابی نہیں ملتی۔ "شاہراہ" میں چھپنے والے قلمکاروں کی فہرست بہت طویل ہے ذیل میں منتخب افسانوں اور ان کے مصنفین کے نام دیۓ جاتے ہیں۔

بہار کے بعد	کرشن چندر	جلد ۱ شمارہ ۲
اندھیری کوکھ	کشمیری لال ذاکر	ایضاً
کنواری	احمد ندیم قاسمی	"۴" ۵
نئی برسات	خواجہ احمد عباس	"۱" ۳-۴
دھنوئیں کی زنجیر	ایضاً	"۱" ۱
اجنبیوں کا شہر	مہندر ناتھ	"۲" ۸
بھیک	حیات اللہ انصاری	جون ۵۵ء
بے چارہ	سہیل عظیم آبادی	مارچ اپریل ۶۳ء

لالی	ہنس راج رہبر	جلد ۳ شمارہ ۹
لے پالک	صدیقہ بیگم	"۳" ۹
مسکین	ستونت سنگھ	"۳" ۷
دیوداسی	شوکت صدیقی	"۲" ۲-۳
ریشم کا دل	دیویندر راسر	"۲" "
ایک جہان یہ بھی ہے	حمید اختر	ایضاً
سپاہی کا بیٹا	احمد ندیم قاسمی	ایضاً ۱۲
نیم کا درخت	رضیہ سجاد ظہیر	"۸" ۵
ایک مکھی اور کئی مکڑیاں	گجیندر سنگھ	"۱۰" ۱۰
کالج کی ایک رات	ساجن دیوروی	جلد ۱۰ شمارہ ۱۱
دل داغ داغ	تبسم	"۱۰ ۱۲
راکھ کی لکیر	محمود عزیز	"۱۲" ۲
چٹان	غیاث احمد گدی	"۶" ۱-۲
مٹی کی گڑیا	جیلانی بانو	"۶" "
گھورے کا پھول	ہاجرہ مسرور	"۶" ۱۱
ضیافت	پرویز شاہدی	"۵" ۹
حماقت	کنہیا لال کپور	"۵" ۹
ڈنکی	اپیندر ناتھ اشک	ایضاً
سیلاب اور غبار سے	اے حمید	ایضاً ۱۱
کیلے کا چھلکا	کوثر چاند پوری	"۱۰" "
پاگل خانے	جوگیندر پال	"۱۲" ۶

اس کے علاوہ "شاہراہ" کے کچھ خاص نمبروں کی تخلیقات خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں جن میں "ناولٹ نمبر" (شمارہ ۱۹۵۸ء میں دوسری زبانوں کے ناولٹوں کے تراجم شامل ہیں جن میں انسانی نفسیات کی بوقلمونیوں اور پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے اور سماجی حقیقت نگاری کو کامیابی سے برتا ہے۔ اس شمارے میں ذیل کے ناولٹ خاصے دلچسپ ہیں۔

غریب لوگ	دستوو سکی ر من موہن تلخ	ص ۷
اے غم دوراں	میکسم گورکی رخلیل احمد	ص ۸۱
پھرتے ہیں میر خوار	تورگنیف ریوسف جامی	ص ۱۰۲
دیار جاناں	نکولائی گوگل ر دلیپ سنگھ	ص ۱۸۱
تسخیر	سومر سیٹ مام ر اے۔ نصیر خاں	ص ۲۰۵
استعفیٰ (ہندی)	جیشندر کمار ر شریف احمد	ص ۲۹۵
گرتی دیواریں (سندھی)	سندری اتم چندانی ر درباری لال	ص ۳۴۹
زمیں دار کی بیٹی (مراٹھی)	شری یات جوگلے ر نور نبی عباسی	ص ۴۳۵
کاہے کو بیاہی بدلیس (گجراتی)	پنالال پٹیل ر نثار احمد فاروقی	ص ۵۲۱

"شاہراہ" کے دیگر شماروں میں بھی اِکّا دُکّا ناولٹ شائع ہوئے ہیں جو مواد اور اسلوب دونوں اعتبار سے عصری ادب میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اس ماہنامے کے آخری شماروں میں افسانوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور نامور قلمکاروں نے اپنی توجہ دوسرے رسائل کی طرف منعطف کرلی۔ لیکن اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ "شاہراہ" نے ترقی پسند افسانے کے فروغ میں بے حد اہم رول ادا کیا اور ایسے فن پاروں کو اپنے صفحات میں محفوظ کیا جو نسل آئندہ کے لیے اس دور کے سماجی و ثقافتی حالات اور ان کے دیرپا اثرات کو سمجھنے کے لیے قابل ذکر وسیلہ بن سکیں گے۔ اس اعتبار سے بھی اس جریدے کی اہمیت اور اور اس کے افسانوی مشملات اہم ہیں۔

"تحریک"

اس پرچے میں دیگر نثری اصناف کے مقابلے میں افسانوی تخلیقات زیادہ شائع ہوئی ہیں۔ اس میں چھپنے کے لیے کسی قسم کی نظریاتی قید نہیں رکھی گئی تھی۔ لہٰذا ہر طرح کے افسانے اس جریدے میں شائع ہوئے۔ نئے لکھنے والے اور کہنہ مشق اساتذہ دونوں اس کو اپنا تعاون دل کھول کر دے رہے تھے۔ "تحریک" کو گوپال متّل اور مخمور سعیدی نے مل کر ادب کی ایک مضبوط روایت کا پاسدار بنایا۔

اس ماہنامے میں شامل افسانوی نگارشات میں زندگی کی رنگینیاں اور رعنائیاں بھی ہیں

اور ناکام آرزوؤں اور تمناؤں کی کراہیں بھی۔ وصل کی لذتوں کی یادیں بھی ہیں اور ہجرو فراق کی اذیتیں بھی' محفلوں کی ہنگامہ آرائی ہے اور تنہائیوں کا سناٹا بھی۔ شب و روز کے حوادث و مسائل بھی ہیں اور عقائد و توہمات کے سائے بھی۔ حسن کی فتنہ سامانیاں بھی ہیں اور عشق کی ستم انگیزیاں بھی۔ فطرتِ انسانی کی بوقلمونیاں بھی ہیں' اور نفسیات کی بھول بھلیاں بھی غرض ان افسانوں میں موضوعات کے اعتبار سے خاصا تنوع نظر آتا ہے چند مثالیں دیکھیے :

عطیہ پروین کا افسانہ "چچی نے خبر سنائی" (فروری ۱۹۶۳ء) بدلتے ہوئے انسانی شعور اور قدیم تصورات میں پیدا شدہ ایک دلچسپ تصادم پر مبنی ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار چچی خلائی ترقیوں کو من گھڑنت کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں مگر نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں سائنس کی پیش رفت پر مکمل ایقان رکھتے ہوئے چچی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔ چچی نہایت مذہبی ہیں اور قدیم روایات کی عزت و احترام کو ضروری جانتی ہیں۔ ان روایات کو وہ مذہب کا حصہ مانتی ہیں اور ان سے متصادم تصورات کے خلاف سوچنے کو بھی تیار نہیں۔ اس افسانے میں اسلوب بیان نہایت دلچسپ ہے۔ کرخنداری زبان اور محاورات کو برجستہ استعمال کیا گیا ہے جس سے افسانے میں لذت پیدا ہو گئی ہے۔ مکالمے خاصے دل کش اور مزیدار ہیں۔

کوثر چاند پوری کا افسانہ "ہری رام" (نومبر ۷۳ء) انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان اپنے ماحول سے بہت کچھ حاصل کرتا ہے خواہ وہ کسی بھی گھرانے میں پیدا ہوا ہو۔ ایک انسان نچلی ذات کا ہو کر اعلیٰ کردار کا مالک ہو سکتا ہے اور بڑے گھر کا فرد اپنے کردار کے اعتبار سے پست اور ذلیل ہو سکتا ہے۔ پس شخصیت کی بلندی اور پستی کا معیار کردار ہونا چاہیے نہ کہ ذات اور دولت و ثروت۔ کردار کی اس بلندی ہی سے متاثر ہو کر ایک بڑے گھرانے کی لڑکی ہری رام ہری جن سے شادی کر لیتی ہے۔ اسی افسانے کا ایک اور ہری جن کردار اپنے اعلا اوصاف کی بنیاد پر ایک ایسے شخص کو اونچ نیچ کا تصور بدلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ صرف اونچے گھرانوں کے افراد ہی شریف اور بلند کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ افسانے کی زبان اور انداز بیان متاثر کرتا ہے۔

رشید امجد کا افسانہ "آدھے دائروں کا نوحہ" (اگست ۱۹۶۸ء) جدید اسلوب میں لکھا گیا

ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک میں لکھے گئے اس افسانے میں انسانی نفسیات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے۔

"تحریک" میں ایک قابل لحاظ تعداد ان افسانوں کی بھی شائع ہوئی ہے جن میں جدیدیت کے رنگ زیادہ گہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کہانیوں میں علامتوں کا استعمال بہت خوبصورت طریقے پر کیا گیا ہے۔ مثلاً افسانہ "الف سے الف تک" (شوکت صدیقی اپریل ۱۹۷۳ء) اپنے علامتی اسلوب کی وجہ سے مفاہیم کی کئی تہیں رکھتا ہے جو غور کرنے پر قاری کے ذہن میں کھلتی جاتی ہیں۔ اس افسانے میں پتنگ کو علامت بنا کر انسان کی نفسیات کا بخیہ ادھیڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کرداروں سے عاری اس کہانی میں بے نام شخص "وہ" پتنگ اڑاتا ہے۔ پہلی۔ دوسری' تیسری' چوتھی' پانچویں' چھٹی' مگر یہ ساری پتنگیں ایک مخصوص اونچائی پر جا کر رک جاتی ہیں۔ وہ سوچنے لگتا ہے شاید کوئی چھت ہے جو ان پتنگوں کو آگے جانے سے روکتی ہے۔ خیر اب کی بار پورا جائزہ لینے کے بعد اس نے ساتویں پتنگ اڑائی اور ہواؤں سے منت کی۔ اب کی بار ڈور لرزتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ بے اختیار ڈور کر ڈھیل دے رہا تھا۔ اور پتنگ بڑھتی چلی جاتی تھی۔ پتنگ کی ڈور سے اس کی انگلیوں میں زرد زرد لکیریں بنیں جو دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہو گئیں۔ اچانک پتنگ ڈھیر ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ یقیناً پتنگ میں کچھ خرابی ہے۔ اس نے نہایت محتاط ہو کر پتنگ بنانا شروع کی۔ اب تک وہ ہر ممکنہ ڈیزائن اور رنگ کی پتنگ بنا چکا تھا لیکن ناکام رہا تھا۔ اچانک اس بار ہوائیں اس کے ساتھ وفادار ہو گئیں اور مڑ مڑ کر قطار باندھے اس کی طرف تکتی رہیں لیکن پتنگ کی سمت تبدیل ہو چکی تھی۔ ابھی وہ اسے ڈھیل دے ہی رہا تھا کہ پتنگ زمین پر آ گری اور اس کی انگلیوں کو سانپوں نے ڈس لیا۔ پتنگ دھول میں منہ چھپائے ہانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں صدیوں کی محرومی جھلک رہی تھی۔

افسانے کی فضا مبہم ہے۔ تنہائیوں اور محرومیوں کو علامتی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"کیچڑ اور کنول" (مختار احمد۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء) ایک طوائف کی لڑکی کا المیہ ہے۔ بیلا دیوی کی لڑکی اٹھارہ سال کی ہونے والی ہے۔ بیلا دیوی بوڑھی ہو چکی ہے۔ چونکہ اس کی لڑکی جوان ہے اس لیے گاہک اب بھی اس کے کوٹھے پر آتے ہیں۔ بیلا دیوی اس کے مستقبل کے تحفظ

کے لیے اس سے پیشہ کرانا چاہتی ہے۔ لیکن بیٹی اس گندگی سے نکلنا چاہتی ہے۔

جشن کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ ایک سیٹھ کے ہاتھ لڑکی کی نتھ کا سودا کر دیا گیا ہے۔ رات کو سیٹھ لڑکی کے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے چیخوں کی آوازیں آئیں۔ کمرہ کھولا گیا تو سیٹھ اور لڑکی دونوں کی لاشیں فرش پر پڑی تھیں۔

ان افسانوں میں موضوعات کے ساتھ ساتھ اسالیب بیان کی سطح پر بھی تنوع نظر آتا ہے۔ بعض افسانے روایتی بیانیہ کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ بعض میں کہانی یا تو خود کسی کردار کی زبانی بیان کی گئی ہے اور واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں خطوط کی تکنیک کا سہارا لیا گیا ہے تو کہیں ڈائری کی۔ "تحریک" کے افسانوں کی زبان کہیں سادہ اور بامحاورا ہے تو کہیں رنگین اور مرصع اور بہت سے افسانے ایسے بھی ہیں جن میں زبان کے روایتی ڈھانچے کو نئے مفاہیم میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارا افسانہ دراصل ان لوک کتھاؤں کی ترقی یافتہ شکل ہے جو ہم اپنی نانی امی یا دادی اماں سے سنتے آئے ہیں۔ اگر ہم واقعی اپنے افسانے کی اس اوریجن Origin سے واقف ہیں اور انہیں بنیادی صفات کو مقدم جانتے ہیں تو ہمارے افسانہ کو مغرب کی اندھی تقلید کے بجائے واقعات نگاری کی اس روایت کا احترام ملحوظ رکھنا پڑے گا جس میں اعلیٰ انسانی قدروں کی برتری اور دل بہلانے کا عنصر حاوی ہوتا ہے۔ یہ صفات "تحریک" کے بیشتر افسانوں میں ہمیں ملتی ہیں۔ انہی صفات کو ہم افسانے کا افادی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ "تحریک" میں شائع ہونے والے افسانوں میں کسی نظریے کی تبلیغ کا سراغ نہیں ملتا ہاں جدید عہد کے منفی ریوں کی فن کارانہ عکاسی کے ذریعے قاری کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی ضرور کوشش کی گئی ہے کہ وہ اسلاف کی قائم کردہ انسان دوستی پر مبنی قدروں کو مشینوں اور خود غرضیوں کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچائے۔ لیکن ان کوششوں کے نتیجے میں ادب کا جمالیاتی پہلو دبنے نہیں پایا ہے۔ "تحریک" میں جو افسانے چھپے ان میں بیشتر ایسے قلمکاروں کے لکھے ہوئے ہیں جنہیں زبان کو برتنے کا سلیقہ آتا ہے لہٰذا مختلف علاقوں کی بولیوں کی آمیزش بھی ان میں ملتی ہے۔ بعض گمنام بزرگ افسانہ نگاروں کے افسانے بھی اس میں چھپے ہیں۔ یہ افسانے برجستگی زبان کا انوکھا لطف رکھتے ہیں۔ ذیل میں چند منتخب افسانوں اور ان کے تخلیق کاروں کے نام پیش ہیں۔

روشنی اور اندھیرا	عرفان حسین	جون ۱۹۶۸ء

ایک دائرہ اور	بدیع الزماں	مئی ۱۹۶۸ء
ہم اور وہ	انوار علیگی	جنوری ۱۹۶۸ء
سفر حدِ سفر	فاروق راہب	مئی ۷۳-۱۹ء
زرد رنگ کا تولیہ	قمر احسن	جولائی ۷۳-۱۹ء
شہر اور آنکھیں	شموئیل احمد	اکتوبر ۷۳-۱۹ء
صاحبقراں	قمر احسن	نومبر ۷۳-۱۹ء
پیرس کا آدمی	دیویندر ستیارتھی	اگست ۱۹۶۸ء
جلتے جسموں کی کہانی	شفق	اپریل ۷۵-۱۹ء
مریض	رفعت سروش	اپریل ۷۵-۱۹ء
منتری سے مسافر	مجتبیٰ حسین	فروری ۷۴-۱۹ء
حوالدار ڈونگر سنگھ	وصی اقبال	اپریل ۱۹۶۲ء
جاگ اے سوزِ دروں	سہیل واسطی	جنوری ۱۹۵۳ء

اس کے علاوہ بلونت رائے پریمی، شانتی ٹانگری، ستندر سنگھ، حسن منظر، محمد تیمور ٹھاکر پونچھی، ناصر حسین زیدی، رائے زادہ، شمس صدیقی، راجہ راز، رفعت علی خاں، جگدیش چندر، رفعت نواز وغیرہ کے افسانے بھی اس جریدے میں شامل ہیں جو افسانے کی تبدیل ہوتی صورت حال کے ترجمان ہیں۔

"تلاش" اور "تخلیق"

ان رسائل کے افسانوں میں بعض قدیم انداز کے ہیں اور بعض میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے۔ دونوں میں تقریباً ایک ہی طرز کی افسانوی تخلیقات شائع ہوئی ہیں جن میں شہری اور دیہی سماج کے فرد کی پریشانیوں اور جدوجہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عہد حاضر کے گوناگوں مسائل اور تیزی سے بدلتی ہوئی انسانی قدروں کا ماتم ان افسانوں کا قابل ذکر پہلو ہے جس کی ترجمانی جدید فنی اصولوں کے احترام کے ساتھ کی گئی ہے۔ ان رسائل میں زیادہ تر افسانے تو مروجہ اسلوب میں ہی ملتے ہیں لیکن ہر شمارے میں ایک دو افسانے علامتی پیرائے میں بھی لکھے گئے ہیں۔ دونوں رسائل ایک ہی مدیر کی ادارت میں جاری ہونے کی وجہ سے ان میں

مخصوص قلمکاروں کی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی مختصر مدت کی اشاعتوں میں مختلف انداز کے افسانے شائع ہوئے۔ ان افسانوں میں فن کا کامل شعور عکس پذیر ہے۔ ذیل کے افسانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

تلاش

یہ موتی ابھی کچے ہیں	ٹھاکر پونچھی	اپریل ۱۹۶۳ء
یہ کھیل	عادل رشید	ایضاً
اے طائرِ لاہوتی	سینہ نشاط	ایضاً
دھرتی کی پیاس	شائستہ بالی	ایضاً
صدقے تری آواز کے	برجموہن طوفان	ایضاً
ڈاکو	آفتاب احمد	ایضاً
جب رات جاگتی ہے	مدن سنگھ ٹھاکر	ایضاً
دو وجود ایک سایہ	غلام رسول سنتوش	ایضاً
لیلیٰ مجنوں ۶۴ء	خواجہ احمد عباس	جنوری تا اپریل ۶۴ء
کنچن مائی	دیویندر ستیارتھی	ایضاً
عرشی خالہ	ذکی انور	ایضاً
چوراہا	انور سجاد	ایضاً
یہ کس کی تصویر ہے	اقبال متین	جنوری تا اپریل ۶۴ء
بڑا بابو	اقبال مجید	ایضاً
رشوت	محمد عمر میمن	ایضاً
پوسٹر	سریندر پرکاش	ایضاً
اچھوتی	قیصر تمکین	ایضاً
تہہ در تہہ	بلراج مین را	ایضاً
میں چپ ہوں	گروبچن سنگھ	ایضاً
ایک رات کی ملکہ	نور شاہ	ایضاً

تخلیق

دل کا موسم	دیویندر ریستار تھی	اکتوبر ۱۹۶۱ء
ماں	گوپال کرشن بیدی	ایضاً
دل سا دوست	نریندر شمپل	ایضاً
دس بج کر دس	لوچن بخشی	نومبر ۶۱ء
عشق ہے محو تماشا	امر سنگھ	ایضاً
شریف زادہ اور طوائفیں	سدرشن بالی	دسمبر ۱۹۶۱ء
امید کے سائے	وصی اقبال	ایضاً
بارہ فٹ لمبا انسان	موہن یاور	ایضاً
سحر ہونے تک	یونس عابدی	ایضاً

مذکورہ فہرست میں جو نام آئے ہیں ان میں بعض روایت پسند ہیں لیکن بیشتر کا رجحان جدیدیت کی طرف ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھیے تو لگتا ہے ایک ہلکی سی دھند افسانے میں چھائی ہوئی ہے اور اس دھند کے پار کئی منظر آپس میں خلط ملط دکھائی دیتے ہیں۔ روایت پسندوں کے یہاں مطلع صاف رہتا ہے اور کہانی بالکل روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے اس میں نہ ابہام ہوتا ہے نہ تہ داری۔ سب کی سمجھ میں آسانی سے آجانے والا اسلوب ان روایتی کہانیوں میں ملتا ہے کیوں کہ مروجہ زبان کو مروجہ اصولوں کے مطابق برتا ہے جب کہ جدید افسانوں میں یہ اصول بکھرے پڑے ہیں اور نئے اصول ان کی جگہ لے رہے ہیں ان میں بغاوت کا عنصر تو ہے لیکن تعمیری مقصد لیے ہوئے۔ بہر حال "تلاش و تحقیق" کے افسانے نئی فضا اور تازگی کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ زبان و بیان کا نیا پن بھی ان میں محسوس ہوتا ہے۔

"محور"

نریندر نشچل کی ادارت میں شائع ہونے والے اس دوماہی پرچے کے مشتملات بھی گو کسی خاص ادبی نظریے کے پابند نہیں لیکن ان میں ایک علامتی مزاج کہیں کہیں ضرور پایا جاتا ہے۔ ہاں زیادہ تر افسانے سادہ اور آسان اسلوب کے حامل ہیں۔ جن میں ہمعصر اردو افسانے کے ابھرتے ہوئے رجحانات کی عکاسی ملتی ہے۔ لیکن اس بات کا خیال ضرور رکھا گیا ہے کہ افسانے عوامی دلچسپی کے حامل ہیں کہ نہیں۔ اسی لیے ان میں دقیق زبان اور پیچیدہ

اسلوب نہیں ملتا۔ سیدھے سادے بیانیہ انداز میں کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ موضوعات زیادہ تر عشق و محبت سے متعلق ہیں بعض میں انسانی زندگی کے مسائل کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ مثلاً ممتاز مفتی کا افسانہ "صرف آپ کے لیے" (دسمبر ۱۹۶۶ء) ایک دلچسپ عشقیہ افسانہ ہے جس میں ایک نوجوان ایک خوبصورت لڑکی کا چہرہ اور جسم دیکھے بغیر محض اس کے پیروں کو دیکھ کر ہی اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس کے بدن کی بدبو لڑکی کے لیے ناگوار ہوتے ہوئے بھی اشتعال انگیز ثابت ہوتی ہے لیکن عاشق اس بدبو کو اپنی کمزوری سمجھتے ہوئے بدبو پیدا کرنے والے غدود کو آپریشن کے ذریعے جسم سے نکلوا دیتا ہے اور جب وہ اپنی محبوبہ کو پیغام نکاح دینے کے لیے پہلی بار ملاقات کر کے حقائق سے باخبر کرتا ہے تو رومانی جذبات سے مملو لڑکی کے چہرے کی سرخی اس وقت زردی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اطہر کے جسم سے وہ مخصوص بو پیدا کرنے والے غدود نکل چکے ہیں۔

انسانی نفسیات کا یہ عجیب و غریب معمہ ممتاز مفتی کے اس افسانے کو جدت و ندرت عطا کرتا ہے ورنہ سارا افسانہ عام عشقیہ افسانوں جیسا ہے۔

ذکی انور کا افسانہ "اجنبی اور اجنبی (دسمبر ۱۹۶۶ء) بھی عشقیہ کہانی ہے لیکن اس کہانی کی فضا میں نیاپن ہے اور قربانی کی دلچسپ داستان ہے۔ رشو کے محبوب پروفیسر زیدی کی شادی دوسری لڑکی سے طے ہو جاتی ہے۔ زیدی خاندانی مراسم اور تعلقات کی وجہ سے انکار نہیں کر سکے۔ لیکن رشو کی بہن روحی نے جو کہ زیدی کی اسٹوڈنٹ ہے، ان کے ساتھ ایک اوباش لڑکی کی طرح داشتہ کا ناٹک کر کے پروین کے والد کو رشتہ توڑنے پر مجبور کر دیا۔ روحی اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی ہے اور رشو کا نکاح زیدی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ لیکن بعد میں روحی کو پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی تو زیدی کے عشق میں گرفتار ہو چکی ہے۔ وہ اپنے جذبات کا گلا گھونٹ لیتی ہے۔ ایک مسلسل خاموشی ایک دن اس کی دائمی خاموشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ روحی مرجاتی ہے۔

"دوسرا مینو" (اقبال مجید اگست ۱۹۶۶ء) مہنگائی پر نہایت اثر انگیز افسانہ ہے۔ "پاپی پجاریوں کی سنتان" (علی محمد لون، اگست ۱۹۶۶ء) نئی اور پرانی قدروں کی شناخت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ آج کا خود غرض انسان اپنے ماضی اور اس کی شاندار روایات سے بے نیاز ہے۔ اس افسانے میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ "محور" کے دوسرے قابل ذکر افسانوں میں

سے چند ذیل میں درج ہیں۔

"پہلی موت" (قاضی عبدالستار) ایک ایسے مسئلے پر مبنی ہے جو آزادی کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ خاص طور پر وابستہ ہے۔ ہندوپاک کے درمیان ہونے والے میچ کو موضوع بناکر قاضی صاحب نے ایک مسلمان کو ہندوستان کی جیت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ لیکن یہ مسلمان اس وقت بیحد رنجیدہ خاطر ہوجاتا ہے جب اس کا ہندو دوست اس کی خوشی پر شک کا اظہار کرتا ہے۔ حب الوطنی کا درس دینے والے اس افسانے کا اسلوب بیحد جاندار ہے۔ اسی طرح ذیل کے افسانے بھی متاثر کرتے ہیں۔

زندگی اور موت کے درمیان	کوثر چاندپوری	اگست ۱۹۶۶ء
گرتی دیواریں	احسان الحق	ایضاً
نئی قوم کے لوگ	کمار پاشی	دسمبر ۱۹۶۶ء
مسیحا	نازش انصاری	ایضاً
بڑے شہر کے تابوت	یوگیش گپت	ایضاً

"محور" کے دریافت شماروں میں شامل افسانوں کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس رسالے میں سنجیدہ ادبی تخلیقات کی نسبت بیسویں صدی کی سطح کے افسانے زیادہ شائع ہوئے ہیں جن کا مقصد عام قاری کو زیادہ سے زیادہ قریب لانا تھا۔ یہ افسانے آسان زبان اور سادہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔

۶۔ "عصری ادب" "عصری آگہی"

"عصری ادب" کے مشتملہ افسانے ایک خاص طرز فکر کی نمایندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں موضوع کے انتخاب کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ جریدہ سماج کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح پہچانتا اور سمجھتا ہے۔ اس پرچے میں چھپنے والا افسانوی ادب جدید اسلوب میں نئی عصری حسیّت کا ترجمان ہے۔ عشق و محبت کے مروجہ موضوعات کے ساتھ ساتھ اس پرچے میں انسانی سماج اور اس میں افراد کی حیثیت اور نفسیات پر تجزیاتی مشاہدے ملتے ہیں۔ گرچہ اس پرچے کا بنیادی مقصد ترقی پسندیت کو فروغ دینا ہے لیکن اس پرچے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مدیر نے مشتملات کے انتخاب میں کسی جانب داری کا

مظاہرہ نہیں کیا اور افسانے میں جو نئے رجحانات پیدا ہوئے ان کا خوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصری ادب میں جہاں سماجی حقیقت نگاری پر مبنی افسانے شائع ہوئے ہیں وہیں انفرادی الجھنوں اور پریشانیوں پر بھی جدید اسلوب کے ساتھ افسانے ملتے ہیں۔ عشق و محبت چوں کہ ایک فطری جذبہ ہے اور ایک آفاقی قدر ہے لہٰذا قارئین خواہ وہ کسی ذہنی سطح سے تعلق رکھتے ہوں اس طرح کے موضوعات کو پسند کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عصری ادب میں عشقیہ موضوعات پر جدید اور کامیاب افسانے ملتے ہیں۔ ان افسانوں میں اسلوب اور موضوع دونوں سطحوں پر تنوع نظر آتا ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں :

"پتھر کا دل" (عصمت چغتائی شمارہ ۵۲۰۱۹ ۱۹۷۷ء) ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی ماں مرجاتی ہے اور باپ پہلے ہی مرچکا ہے۔ ایک منھ بولی آنٹی اس کی پرورش کرتی ہے اور اس کو بمبئی بھیج کر عیش کے ساتھ تعلیم دلواتی ہے۔ گریجویشن کے بعد گھر واپس آنے پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ آنٹی مقروض ہے۔ لڑکی نوکری کرکے ان کی مدد کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے لیکن آنٹی کا اصرار ہے کہ وہ جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرلے۔ لڑکی کے انکار پر آنٹی کہتی ہے کہ تو کتنی پتھر دل ہے۔ میں نے تجھے آزمالیا۔ اور وہ عہد کرتی ہے کہ اس لڑکی کو کچھ نہیں بننے دے گی۔

"گھروندا" (حیات اللہ انصاری جولائی ۱۹۷۶ء) ناول کا ایک باب ہے۔ اس ناول کا موضوع دراصل سماجی اخلاقیات سے متعلق ہے۔ کہانی میں ایک بنجارن لڑکی رنگین ایک شہری لڑکے شہاب سے محبت کرتی ہے۔ بنجارنوں کے اپنے طور طریق اور رسم و رواج ہوتے ہیں۔ جن چیزوں کو شہر والے فحش سمجھتے ہیں وہ ان کے یہاں عیب نہیں۔ شہاب کو رنگین کی کچھ عادتیں پسند نہیں لیکن بعد میں وہ سوچتا ہے کہ ان کے اپنے رسم و رواج ہیں اپنے مسلمات ہیں اپنی اخلاقی قدریں ہیں مجھے اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ بنجارن لڑکی شہاب کو بتاتی ہے کہ تمہارے شہر کے لوگ وہ کام چھپ کر کرتے ہیں جو ہم کھلے عام کرتے ہیں اور پھر وہ شہر کے معززین کے پوشیدہ کارنامے سناتی ہے۔

عام طور پر خیر و شر، نیکی اور بدی کے جو تصورات ایک قسم کے سماج میں قابل قبول سمجھے جاتے ہیں وہ دوسری قسم کے سماج کو قبول نہیں ہوتے۔ اخلاقیات کے یہ تصورات کیسے بنتے اور بگڑتے ہیں اور کس طرح ان کے باہمی ٹکراؤ سے نئے سوالات ابھرتے ہیں۔ یہی اس

ناول کا موضوع ہے۔ اخلاقی اقدار کے اس مطالعے کے لیے حیات اللہ انصاری نے ایک سادہ سماج کو منتخب کیا ہے۔

"لذت سنگ" (کوثر چاندپوری، جولائی ۱۹۷۰ء) نوجوانوں کو حرکت و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ کہانی یوں ہے۔ ایک گاؤں میں بہت سے لڑکے لڑکیاں قریب میں بہنے والے دریا کی نذر ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان کی محبوبہ بھی اس میں غرق ہو جاتی ہے تو وہ اس دریا سے اس طرح انتقام لیتا ہے کہ شہر سے انجینئرنگ سیکھ کر گاؤں کے عوام کی مدد سے دریا پر پل تعمیر کر دیتا ہے۔ مکالمے کی مدد سے لکھی گئی یہ کہانی روایتی بیانیہ کا اسلوب رکھتی ہے۔

"کولمبس اور کلیشے" (جنوری ۱۹۷۰ء) قدرے مشکل الفہم ہے لیکن اسلوب دلکش ہے۔ مکالمے کی شکل میں کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ مکالمے کولمبس اور کلیشے کے درمیان ہوتے ہیں۔ کلیشے کولمبس سے ازراہ تفریح کہتا ہے کہ آپ کی تلاش بے سود ہے کیوں کہ آپ جس زمین کو تلاش کرنے نکلے تھے وہ آپ کو نہیں مل سکی بلکہ امریکہ پہنچ گئے۔ غرض اسی قسم کی بات چیت دونوں کے مابین ہوتی ہے۔

"سکنڈ ہینڈ کا مریض" (شفق۔ شمارہ ۸۔ ۱۹۷۱ء) جدیدیت کا ترجمان ہے۔ علامتوں اور استعاروں سے کام زیادہ لیا گیا ہے۔ راوی اپنے کھوئے ہوئے وجود کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ ان افسانوں کے علاوہ مندرجہ ذیل تخلیقات بھی خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں:

ننھے مُنّے (ناول کا ایک باب)	عصمت چغتائی	جولائی اکتوبر ۷۶ء
اپنا اپنا ایمان	کرتار سنگھ دگل	ایضاً
دیوالی	قاضی عبدالستار	ایضاً
پیاسے	عابد سہیل	ایضاً
خط منحنی	یوسف احمد	ایضاً
گاؤں گھورنی	رام لعل	اکتوبر تا جنوری ۷۹ء
نہ جانے کیوں	ششیر دیپ	ایضاً
دھندھ اور دھول	کنور سین	ایضاً
ایک بستی کی کہانی	یونس جاوید	ایضاً
آنے والے لوگ	افسر آذر	مئی۔ اگست ۱۹۷۷ء

چھوٹی سی بات	آمنہ ابوالحسن	ایضاً
مور سرائے	دیویندر ریتار تھی	جولائی ۱۹۷۹
بازدیہ	جوگیندر پال	ایضاً
شعلہ پوش	اقبال متین	ایضاً
تخلیق کا کرب	عائشہ صدیقی	جولائی ۷۹ء
روشنی روشنی	احمد یوسف	ایضاً
عسکر	نسیم محمد جان	ایضاً

عصری آگہی کی مدت اشاعت زیادہ نہیں لیکن اس رسالے نے افسانے کے جدید رجحانات سے ہم آہنگ ہو کر قارئین میں ترقی پسندی کا نیا اور وسیع مفہوم متعارف کرایا۔ اس رسالے میں نسبتاً کم افسانے شائع ہوتے تھے لیکن جو افسانے بھی شائع ہوتے تھے وہ معیاری اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ ان افسانوں میں صنعتی تہذیب کے بخشے ہوئے زخموں کی ٹیس بھی ہیں اور کھوکھلی روحانیت پر تنقید بھی۔ بعض افسانے عشق کی طرفہ انگیزیاں بھی لیے ہوئے ہیں تو بعض محض جنسی نفسیات کے شارح و عکاس ہیں۔ کہیں کہیں انفرادی زندگی کا کرب ہے تو کہیں اجتماعی مسائل کی تصویر کشی۔ کسی افسانے میں اصلاح سماج کا جذبہ موجزن ہے تو کسی میں حوصلہ مندی کا درس۔ غرض روایت اور جدید ہر طرح کے موضوعات پر افسانے لکھے گئے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں :

جیلانی بانو کے افسانے "میں" (مئی ۷۹ء) میں ایک چھوٹا بچہ اکثر اس احساس سے مونجھن ہو جاتا ہے کہ پیدائش کے وقت وہ کچھ اور تھا اور اب کچھ اور ہے۔ یعنی وہ کسی اور کا بچہ ہے اور نہ جانے وہ بچہ کہاں ہو گا جس کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ ماں کے ڈانٹنے کو وہ اس طرح معنی پہناتا کہ یہ اس لیے ڈانٹ رہی ہے کیوں کہ میں ان کی اولاد نہیں۔ پوری کہانی میں وہ خود کو تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اگر کسی اخبار میں کسی گمشدہ بچے کی تصویر چھپی ہوتی تو اسے دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ یہی وہ بچہ ہو گا جو بدل گیا ہے۔ یعنی میں ہوں۔ اور وہ اس پتے پر پہنچ جاتا ہے کہ لو میں آگیا۔ لوگ اسے پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ پھر اپنی تلاش میں حیران و سرگرداں پھرتا ہے۔

گمشدہ تاریخ کا ایک باب (عبد الصمد مئی ۱۹۷۹ء) واحد متکلم کی زبان میں لکھا گیا۔ بے

حد دلچسپ افسانہ ہے۔ ایک شخص جس کو ایک بوڑھا آدمی سہارا دیتا ہے اور اس بوڑھے کے مرنے کے بعد وہ شخص اس کی جائداد کا مالک بن جاتا ہے۔ بوڑھے شخص کے آثار کا اس نے اس طرح احترام کیا کہ اس کی کٹیا کی جگہ سرائیں بنوادیں تاکہ مسافروں کو آرام مل سکے۔

پھر اس شخص نے محسوس کیا کہ ادھر سے لوگ ادھر جاتے ہیں ان کے پاس نہایت خوبصورت ڈبہ ہوتا ہے اور جس کی حفاظت وہ رات بھر جاگ کر کرتے ہیں۔ اب اس نے ڈبے کو حاصل کرنے کے لیے ان مسافروں کو مارنا شروع کردیا اور ڈبہ کے راز تک پہنچ گیا۔ وہ دیکھتا ہے کہ ڈبے میں ایک اور ڈبہ اور اس میں ایک چھوٹی سی ڈبیہ رکھی ہوتی ہے اور اس ڈبیہ میں سوکھی روٹی کے ٹکڑے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دوسری طرف سے آنے والے مسافروں کے پاس بھی ویسا ہی ڈبہ ہے تو وہ ان سے بھی ڈبہ چھین لیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ان میں بھی ڈبیہ اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے ہیں۔ پھر ایک قافلہ آتا ہے۔ قافلہ والوں کے پاس ایک بڑا سا صندوق ہے۔ وہ ان سب کو سرائے میں سلا دیتا ہے اور محافظوں کو قتل کر کے صندوق کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں ان انسانوں کے کٹے ہوئے اعضاء دیکھتا ہے۔ جنہیں اس نے قتل کیا تھا۔ وہ زور سے چیخ مارتا ہے اور قافلے والے جاگ پڑتے ہیں۔ وہ ان سے بچنے کے لیے بھاگتا ہے اور قافلے والے باوجود کوشش کے اس کو پکڑ نہیں پاتے کیوں کہ وہ جسم کی قید میں ہیں اور وہ روح کے قالب میں ڈھل چکا ہے۔

پورا افسانہ علامتی ہے۔ کہانی میں سرّیت ہونے کی وجہ سے اصل مفہوم تک پہنچنا عام قاری کے بس کی بات نہیں لیکن علامت بذاتِ خود اتنی دلچسپ ہے کہ اگر اصل مفہوم تک رسائی نہ بھی ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دلچسپ پیرائے نے کہانی کو دلچسپ بنادیا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا افسانہ "وہ آدمی" (جولائی ۷۹ء) صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں کے بحران کو پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اوپر سے خوشحالی نظر آنے والے مغربی لوگ اندر سے کتنے پیاسے ہیں۔ انسانوں کے درمیان رہنے والے انسان ایک دوسرے سے ملنے کو کتنے تڑپتے ہیں۔ بے پناہ دولت ہونے کے باوجود تنہائیاں ان کا مقدر ہو چکی ہیں۔ جن کو دور کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار۔ اس افسانے میں ایک شخص کافی ہاؤس میں انگریز لڑکے لڑکیوں کو دیکھتا ہے۔ کافی ہاؤس سے باہر آنے پر ان میں سے ایک چوراہے پر بھیک مانگ رہا ہے۔ یہ شخص اس انگریز کو کھانا کھلانے ہوٹل میں لے جاتا ہے جس کا بل وہ انگریز خود ادا کرتا

ہے اور کہتا ہے کہ بھیک مانگنے کا ڈرامہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ مجھے کوئی ساتھی چاہیے کیوں کہ ہمارے ملک میں جذبات کا یکسر فقدان ہے اور لوگ ایک دوسرے سے ملنے کو ترستے ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹیکسی پکڑ کر چلا جاتا ہے۔

"دریچہ" (آمنہ ابو الحسن جون ۱۹۷۹ء) جوانی کے بڑھاپے میں تبدیل ہونے سے پیدا ہونے والی خوف زدگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ راویہ انسانی زندگی کے اس المناک انجام سے بچنے کے لئے ایک ایسا دریچہ کھولنا چاہتی ہے جس سے بھرپور مناظر کی تمام دلکشی اور توانائی زندگی کا حصہ بن جائے ورنہ تمام سہاگن راتیں اندھیرا بن کر اس میں سما جائیں گی۔

اس رسالے کے دیگر اہم افسانوں میں رتن سنگھ کا "ہو کا عالم" ہے۔ جس میں ساحل کو تمثیل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بے نام کرداروں پر مشتمل اس کہانی میں ساحل سمندر سوچتا ہے کہ آج یقیناً کوئی نئی بات ہے کیوں کہ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ یہ خوشیاں ایک قافلے کے آنے سے ہیں جس کے لوگ ناچ گا کر سو گئے ہیں اور ساحل کو ان سے بہت کچھ نیا ملتا ہے۔ لیکن پھر سب سو جاتے ہیں۔ ساحل سب کو جگاتا ہے لیکن کوئی نہیں اٹھتا۔ پرانی تہذیب کبھی کی مر چکی۔ دریا کے پاٹ پیاسے ہیں۔ اب کوئی گوری پانی بھرنے نہیں آتی۔ گاؤں سے دھنواں اٹھ رہا ہے۔ صنعتی تہذیب کا آسیب سب کچھ نگل گیا۔

ان مثالوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "عصری ادب" کی طرح "عصری آگہی" کے مدیر بھی اردو افسانے کے جدید رجحانات پر قدغن لگانے کے بجائے ان کو خندہ پیشانی سے قبول کر رہے تھے۔ ان کے رسائل میں شائع ہونے والے افسانے ایک طرف بیانیہ اسلوب میں سماجی حقیقت نگاری کا وسیلہ ہیں تو دوسری طرف علامتی پیرائے میں ماضی پرستی اور باطنی کیفیات کی عکاس۔ جن افسانوں میں سماج کے داخلی حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے ان میں بھی روایتی اور جدید دونوں طرح کے اسالیب کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ذیل میں چند اور افسانوں کے عنوانات درج ہیں۔

قحط دمشق گھوڑے اور وہ	انور قمر	جولائی ۱۹۷۹ء
ندی پار کرنے والا	رشید عارف	اگست ستمبر "
جھاگ	انور عظیم	اکتوبر "
نیلا تھوتھا پینے والا	کنور سین	" "

چائے پانی	شمیم صادقہ	" "
تیسری دنیا	جوگیندر پال	مئی ۱۹۷۹ء
نیا یگ	بلراج ورما	نومبر ۱۹۷۹ء
مستی	سلام بن رزاق	دسمبر "
سونے کی مہر	مرزا حامد بیگ	اکتوبر ۱۹۸۰ء
بھوک	شکیب نیازی	فروری "
چہرہ پس چہرہ	حسین الحق	" "
رہے نام اللہ کا	اقبال مجید	جولائی "
نوادرات	الیاس احمد گدی	" "

یہ فہرست ظاہر کرتی ہے کہ "عصری آگہی" کے افسانوی مشملات اپنے دور کی نفسیاتی الجھنوں اور سماجی وانفرادی مسائل کو فن کارانہ انداز میں پیش کرنے کا عمدہ وسیلہ ثابت ہوئے ہیں۔

۷۔ "سطور"

"سطور" کے افسانے جدیدیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے تھے جن میں زیادہ تر افسانے علامتی پیرائے میں لکھے جاتے تھے۔ ان افسانوں میں بعض میں ابہام اتنا شدید ہوتا تھا کہ افسانے کے اصل مفہوم تک رسائی مشکل ہوتی تھی۔ مثلاً شرون کمار ورما کا افسانہ "لاحاصل سفر" (ستمبر ۱۹۷۰ء) ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔ جس میں عورت بوڑھا، پہاڑ، روشنی کا درخت، چشمہ آب حیات وغیرہ علامتیں استمال کی گئی ہیں۔ ایک شخص دن ڈھلے ایک اجنبی شہر میں داخل ہوتا ہے۔ مکانوں کے دروازے، کھڑکیاں بند پاتا ہے۔ پھر سارے دروازے اور کھڑکیاں خود بخود کھل جاتی ہیں اور ان میں سے زرد چہرے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اسے کسی جگہ کی تلاش ہے جہاں اسے رات کو قیام کرنے کی اجازت مل سکے۔ شہر کے آخر میں ایک جھونپڑی نظر آتی ہے۔ جس میں ایک خوبصورت لڑکی اور ایک بوڑھا رہتا ہے۔ عورت اس کے ساتھ سوجاتی ہے۔ صبح کو وہ پہاڑ پر پہنچتا ہے لیکن روشنی کا درخت اور آب حیات نہیں نظر آتا۔ وہی بوڑھا وہاں موجود ہے اور زور سے قہقہہ لگاتا ہے۔ وہاں بہت سے انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ شہر کی طرف سرپٹ بھاگتا ہے۔ شہر کے لوگ اسے گھیرے میں

لے کر خوشی سے ناچتے ہیں۔

"آرٹ گیلری" (سریندر پرکاش شمارہ ۱) میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا آرٹ گیلری میں آنے جانے والوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور مرجاتا ہے۔

سطور کے علامتی افسانے دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض افسانے قدرے آسان پیرائے میں بھی لکھے گئے ہیں۔ زیادہ تر علامتی افسانوں میں پوری کہانی ہی علامت بنا کر پیش کی گئی ہے کچھ ایسے بھی ہیں جن کا ہر واقعہ ایک علامت ہے اور ایسے افسانے بھی ہیں جن میں الفاظ کو علامت بنایا گیا ہے۔ سریندر پرکاش کے افسانوں پر خصوصی شمارہ میں متعدد ایسے افسانے ملتے ہیں مثلاً "بن باس" مردہ آدمی کی تصویر" "ہم صرف جنگل سے گزر رہے تھے" "جمغورۃ الفریم" "کٹا ہوا سر" "گاڑی بھر رَسَد" برف پر مکالمہ وغیرہ (مارچ ۱۹۸۰ء) "سطور کے ذیل کے افسانے بھی خصوصی طور پر قابل مطالعہ ہیں :

کوئی دروازہ نہیں	شرون کمار	شمارہ ۱
دھواں	اظہار الاسلام	مارچ تا مئی ۷۸ء
اندھیرے میں چلنے والے	عبد الصمد	" "
خوشبو	راجیندر پال	" "
جونک	عوض سعید	ستمبر نومبر "
پُل	ساجد رشید	اپریل ۷۹ء
ایک پرانی کہانی	خالد حسین	" "
پرندہ پکڑنے والی گاڑی	غیاث احمد گدّی	دسمبر جنوری، فروری ۷۸-۷۷ء
کمپوزیشن پانچ	بلراج مین را	"
دھرتی کی پہچان	رشید امجد	ستمبر ۱۹۷۰ء
پرساد	کنور سین	ستمبر ۱۹۷۷ء
کچلی ہوئی شناخت	مظہر الزماں خاں	اگست ۱۹۸۰ء

یہ فہرست بتاتی ہے کہ "سطور" میں اس وقت کے نمائندہ افسانہ نگار چھپتے رہے ہیں۔ اور بلاشبہ یہ وہ قلمکار ہیں جو ہمعصر اردو افسانے کی شناخت سمجھے جاتے ہیں۔ "سطور" نے جدیدیت پسند افسانے کو فروغ دینے میں خاصا اہم رول ادا کیا ہے۔

۸۔ "معیار" "تناظر" "شعور" "ذہن جدید"

ان تمام رسائل کا مزاج ایک جیسا ہے۔ افسانے یا تو خالص علامتی ہیں یا استعاراتی۔ بعض افسانوں میں تمثیلی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ بیشتر افسانوں میں سریت پائی جاتی ہے۔ جدیدیت کی روش پر چلتے ہوئے ان رسائل کے مدیران نے عصری حسیت کا اپنے جرائد کو ترجمان بنایا۔ عالمی ادب کے اثرات کی پرچھائیاں ان رسائل کے افسانوں میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں۔ حالات حاضرہ اور باطنی کیفیات کو نادر علامتوں اور نامانوس استعاروں کے پردے میں پیش کرنے کا رجحان ان افسانوں کا خاصہ ہے۔ بعض افسانے سیدھے سادے اسلوب میں بھی ہیں۔ لیکن ان میں واقعات کے پیچھے کئی دوسرے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان رسائل میں عمومی طور پر ایک ہی طرح کے افسانہ نگار چھپتے رہے۔ مثلاً سریندر پرکاش' سلام بن رزاق' ساجد رشید' انور عظیم' عبدالصمد' شفق' خالدہ اصغر' اقبال مجید' انتظار حسین' قمر احسن' احمد ہمیش انور سجاد وغیرہ۔ ان رسائل میں چھپنے والے اہم افسانے ذیل میں درج ہیں۔

معیار

تقیہ بردار	اکرام باگ	شمارہ ۳
کووں سے ڈھکا آسمان	انور خاں	"
ریڑھ کی ہڈی	انیس رفیع	"
چاندنی کے سپرد	انور قمر	"
نہیں کا سلسلہ ہاں سے	حمید سہروردی	"
وقنا عذاب النار	حسین الحق	"
پڑی اور پہیے	ساجد رشید	"
زنجیر ہلانے والے	سلام بن رزاق	"
گدھ	سید محمد اشرف	"
ڈوبتا ابھرتا ساحل	شفق	"
کرچیاں	شفیع مشہدی	"
بانگ	شوکت حیات	"

جانی انجانی راہوں کے مسافر	عبدالصمد	"
طلسمات	قمراحسن	"
کنواں	م-ق-خاں	"
شہرپناہ	خالدہ اصغر	شمارہ ۱
واپس	انتظار حسین	"
زنداں نامہ	انور سجاد	"
مدافعت	اقبال مجید	"

شعور شمارہ ۳

"آج" (انور سجاد) "بازگوئی" (سریندر پرکاش) "کہانی مجھے لکھتی ہے" (احمد ہمیش)، "مردہ گھوڑے کی آنکھیں" (انور عظیم) "سایہ" (خالدہ اصغر) سائبیریا" (محمد سلیم الرحمان)، "ٹیبلو" (ساگر سرحدی) شمارہ ۱۹۸۱ دسمبر

بجوکا" (سریندر پرکاش)" "کونپل" (انور سجاد)" آخری کمپوزشن (بلراج مین را) رات، دیوار (انتظار حسین) ڈوب جانے والا سورج (غیاث احمد گدی)

ذہن جدید : شمارہ مارچ تا اپریل ۱۹۹۱ء

گونڈوں کا جنگل (انتظار حسین) "جڑیں" (احمد داؤد) "پرندہ اس کی آنکھوں سے" (مظہرالاسلام) "شکون" (بلراج ورما)

شمارہ ستمبر نومبر ۱۹۹۲ء

طوطا مینا کی کہانی (انتظار حسین) "بغیر آسمان کی زمین" (الیاس احمد گدی) "وراثت" (شفق) "بے گھری" (شوکت حیات)۔

مارچ- مئی ۹۳ء

بیتے موسم کا المیہ (دیویندر اسر)" "ہم سفر" (احمد داؤد) "کالے پیروں والے کبوتر" (ساجد رشید)

جون تا اگست ۱۹۹۳ء

آن آف (ممتاز مفتی) شہریہ نصیب (اقبال مجید)

ستمبر۔ نومبر ۹۳ء

کعبہ مرے پیچھے (بانو قدسیہ) کٹم کاٹا (منشا یاد)

دسمبر۔ فروری ۱۹۹۳ء

میوزیکل بیئر (عبد الصمد) آگھوری (سریندر پرکاش)

ستمبر۔ نومبر ۱۹۹۰ء :

دریدر (بانو قدسیہ) ویسے ہی (انور عظیم)

مارچ۔ مئی ۱۹۹۴ء :

دوسری مخلوق (محمود ایوبی) شاخم (ہ۔ا۔رہبر)

مذکورہ بالا رسائل۔ معیار، شعور اور ذہن جدید آپس میں مل کر ایک ایسا سلسلہ بناتے ہیں جو روایتی اسالیب کو آج کے انداز بیان سے جوڑتا ہے۔ ان رسائل نے علامتیت کو فروغ دینے کے بعد حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ یہ اسالیب کم علم اور سطحی ذوق رکھنے والے تفریح پسند قاری کو اس طرح کا اسلوب نہیں چاہئے۔ اسے سیدھا سادہ بیان چاہئے اور دلچسپ واقعات کا سلسلہ تو ہمارے جدید افسانہ نگاروں نے تجرد اور مبہم علامت نگاری کو چھوڑ کر ترسیل کی خاطر سیدھی سادی کہانیاں پھر لکھنا شروع کردی ہیں۔ آج کا افسانہ ماضی کے تجربات سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے اپنے اندر کہانی پن بھی رکھتا ہے اور قدرت بیان بھی متذکرہ رسائل اس بات کا ثبوت دیتے ہیں۔ خاص طور پر ''ذہن جدید'' جو سرتا سرنئے شعور کا نمائندہ رسالہ ہے۔ ایک صحت مند متوازن ادبی رویئے کو پیش کرتا ہے۔

۹۔ ''بیسویں صدی'' ''کتاب نما'' ''ایوان اردو''

''بیسویں صدی'' کی اشاعت میں عوامی دلچسپی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن نامور قلمکاروں میں شاید کوئی ہو جو اس میں نہ چھپا ہو۔ سلسلہ وار ناولوں میں یہ رسالہ پیش پیش ہے۔ ویسے بھی عوامی رسالوں کے لئے یہ ضروری ہے۔ آئندہ شمارے کے لئے قارئین میں تجسس پیدا کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اس رسالے کے افسانے دلچسپ اور آسان پیرائے میں لکھے ہوتے ہیں۔

کتاب نما اور ایوان اردو میں نسبتاً کم افسانے شائع ہوئے ہیں لیکن ان رسائل میں اعلیٰ

ادبی ذوق رکھنے والوں کی دلچسپی کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ دہلی اردو اکیڈمی سے جاری ہونے کے سبب حکومت کی پالیسیوں کا لحاظ ازبسکہ ایوان اردو میں ضروری ہے۔ "کتاب نما" آزاد روش پر گامزن ہے۔ اس میں ہر موضوع پر کھل کر لکھا جاتا ہے۔ دونوں رسائل میں بلند پایہ ادیبوں کی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔ ان رسائل کے افسانے عصری رجحانات کی نمائندگی بدرجہ اتم کرتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کی پرچھائیاں ان کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ نئے نئے اسالیب میں اچھوتے موضوعات پر افسانے ان رسائل میں ملتے ہیں۔ چند عنوانات ذیل میں درج ہیں :

بیسویں صدی

جھیل کے پرندے	کشمیری لال ذاکر	اگست ۱۹۷۸ء
عاشق مزاج روح	اظہار اثر	" "
لہو کی تحریر	عزیز قلبی	" "
چاندنی کا زہر	اقبال مجید	" "
پیاس اور سراب	عفت موہانی	جون ۱۹۸۰ء
بے سبب	انتظار حسین	ستمبر "
اکیلا	رضیہ بٹ	" "
نقل مکانی	بانو قدسیہ	" "
حلوائی کی دوکان	ممتاز مفتی	" "
شیشے کی چٹان (ناول)	سراج انور	جنوری ۸۱ تا دسمبر ۸۱
خلش (ناول)	ایضاً	فروری ۹۰ تا دسمبر ۹۰ء
چاریار (ناول)	خواجہ احمد عباس	مئی تا اکتوبر ۷۸ء
ماضی حال اور مستقبل	رضیہ سجاد ظہیر	مئی ۱۹۷۸ء
گھر کا راستہ	بلونت سنگھ	جنوری ایضاً
پیاسے ہونٹوں کا دریا	رام لعل	جنوری ۸۱ء

کتاب نما

پرچھائیاں	الیاس احمد گدی	جولائی ۸۸ء
دو ادھورے خط	علی امام نقوی	اگست ۱۹۸۸ء
خبر	سلام بن رزاق	اپریل ۱۹۸۹ء
کچھ نہیں ہوگا	شرون کمار ورما	جون ۸۹ء
چکا چوند	قیوم راہی	مارچ ۹۰ء
بھوک	ہرچرن چاولہ	نومبر ۹۱ء

ایوان اردو

دکھ ہرن	جوگیندر پال	مئی ۸۷ء
نیم پلیٹ	طارق چھتاری	مئی ایضاً
شیش محل	م-م-راجیندر	اگست ایضاً
رحمت صاحب	شوکت حیات	نومبر ایضاً
تھانہ	حیات اللہ انصاری	جنوری ۸۸ء
بادیسرے	انور خاں	جون ۸۷ء
ایک ہاتھ کا آدمی	انجم عثمانی	ایضاً
یوں بھی جیا کرتے ہیں	فاطمہ ترمذی	اگست
گھبرائے ہوئے لوگ	منظور وقار	ستمبر
چوڑی والا	صالحہ عابد حسین	اکتوبر
خون	شبنم سلیم احمد	فروری ۸۸ء
خیمے	مشرف عالم ذوقی	مئی
ریزہ ریزہ خواب	اطہر مسعود خاں	مئی ۱۹۸۸ء
بولتے سناٹے	اقبال متین	جون
بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی	سریندر پرکاش	اگست ۸۸ء

مذکورہ جائزے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ افسانے کے ارتقاء و فروغ میں دہلی کے ان ادبی رسائل کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔ اور اردو ادب کے قارئین کو روز بروز

ہونے والی تبدیلیوں سے روشناس کرانے میں ان رسائل نے برابر خدمت انجام دی ہے۔ جن تحریکات و رجحانات سے ہمارا افسانہ متاثر ہوا ہے اور جو تجربات ہمارے قلمکاروں نے کیے ہیں ان سب کی نمائندگی ان رسائل نے بدرجہ اتم کی ہے۔

افسانے کے ساتھ ساتھ دہلی سے جاری ہونے والے اردو کے ان ادبی رسائل میں دیگر نثری اصناف بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رسائل میں نثر کی جو اصناف شائع ہوتی رہی ہیں ان میں ڈرامے' انشائیے' خاکے' طنز و مزاح' رپورتاژ' خود نوشت' سوانح' سفرنامے' شکاریات وغیرہ شامل ہیں۔

ڈرامہ :

اردو میں ڈرامے کی صنف کو آج تک وہ مقام نہیں مل سکا جو اسے دوسری زبانوں میں حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے رسائل میں افسانوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈراموں کو نہیں۔ پھر بھی بعض رسائل نے گاہے گاہے ڈرامے شائع کیے ہیں۔ اصل میں جو قلمکار ڈرامہ نویس ہیں وہ مالی منفعت کی خاطر ٹی وی اور ریڈیو کے لئے لکھنا پسند کرتے ہیں۔ اردو رسائل بسبب اپنی کم مائیگی کے نگارشات کا معاوضہ نہیں دے پاتے۔ سرکاری اور نیم سرکاری جرائد معاوضہ دیتے بھی ہیں تو برائے نام۔ چوں کہ "آج کل" حکومت کی سرپرستی میں جاری ہوتا ہے اس لئے اس میں لکھنے والوں کو تھوڑا سا معاوضہ مل جاتا ہے۔ اس رسالے میں ڈرامے مسلسل چھپتے رہتے ہیں بلکہ دو ڈرامہ نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ "عصری ادب" اور "شعور" میں بھی ڈرامے شائع ہوتے ہیں کیونکہ یہ نظریاتی طور پر وابستہ رسائل ہیں اور ترقی پسند ہونے کی وجہ سے ہر صنف ادب کو ایک خاص نہج پر فروغ دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اسٹیج ڈرامہ' نکڑ ڈرامہ اور دیگر عوامی ذرائع ابلاغ کو پہلے سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ جدیدیت نے اردو ڈرامے کو ذرا کم منھ لگایا۔ ڈرامہ ہی نہیں بلکہ انشائیہ' خاکہ' خودنوشت' وغیرہ بھی جدیدیت کے ترجمان رسالوں میں کم ملتی ہیں۔

آزادی کے بعد رپورتاژ کو بھی خاصا فروغ ملا ہے۔ یہ صنف بھی بیشتر رسائل میں مل جاتی ہے۔ شکاریات آپ بیتی' سوانح حیات' سیرت' نثری پیروڈی' انشائیے' طنز و مزاح' خاکے' سفرنامے وغیرہ بھی بعض رسائل میں چھپتے رہے ہیں' "آج کل" اس معاملے میں خصوصیت

رکھتا ہے۔ آج کل کے بعد "شاہ راہ" کو یہ مقام حاصل ہے کہ اس میں زیادہ تر نثری اصناف شائع ہوتی تھیں۔ آج کے ادبی منظر نامے میں جن معتبر ڈرامہ نگاروں کے نام نظر آتے ہیں وہ سب کے سب ان رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب، بیگم قدسیہ زیدی، نیاز حیدر، حبیب تنویر، پروفیسر محمد حسن، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، کرتار سنگھ دگل، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر وغیرہ کے اسٹیج ڈرامے، ریوتی سرن شرما کے ریڈیائی ڈرامے اور کنہیا لال کپور کے مزاحیہ ڈرامے ان رسائل میں شامل ہیں۔ ان ڈراموں میں تفریحی عنصر کے ساتھ موضوعاتی افادیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر اپنے اطراف کی پچوشن کو فنکاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بعض میں انسانی نفسیات کے خفیہ دریچوں کو کھولا گیا ہے اور بعض تاریخ کے واقعات کو آج کے حالات سے ہم آمیز کرتے ہیں اور ایک ایسی فضا ہموار کرتے ہیں جس میں عصری مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بعض ڈرامے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی عمدہ مثالیں ہیں۔

انشائیہ :

دستیاب شماروں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ "تخلیق" "تلاش" "محور"، سطور، شعور، معیار، تناظر وغیرہ میں ایک بھی انشائیہ شائع نہیں ہوا۔ البتہ "شاہراہ" اور "آج کل" میں کافی تعداد اس صنف میں شائع ہونے والی نگارشات ملتی ہیں۔ یہ انشائیے حالات حاضرہ اور سماج کی ناہمواری پر دلچسپ تحریریں ہیں۔

طنزومزاح :

یہ صنف ہمیشہ سے عوام و خواص میں مقبول رہی ہے۔ لہٰذا تقریباً تمام رسائل میں طنزومزاحیہ مضامین مل جاتے ہیں۔ ان مضامین میں انسان کی بیوقوفیوں اور حالات کی ستم ظریفیوں پر مزاحیہ انداز میں طنز کی گئی ہے۔ شاہراہ آج کل تحریک اور کتاب نما اس معاملے میں سب سے اہم ہیں۔ یوسف ناظم رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری مجتبیٰ حسین وغیرہ کے مضامین ان رسائل میں برابر چھپتے رہے ہیں - مزاحیہ مضامین جدیدیت کے ترجمان رسائل میں بھی ملتے ہیں۔ ان میں مزاح کم طنز زیادہ ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ترجمان رسائل میں اس طرف توجہ ملتی ہے۔ آج کل میں

انشائیہ، طنز و مزاح، سفرنامہ، شکاریات، آپ بیتی، سوانح حیات، رپورتاژ سبھی خاطر خواہ شائع ہوتے ہیں۔ "شاہراہ" میں بھی یہ تمام اصناف چھاپی گئی ہیں۔

اصل میں ہر صنف میں مواد کی فراہمی قدرے محنت طلب کام ہے۔ جو کہ ہر ایک مدیر کے بس کا نہیں۔ پابندی وقت کے ساتھ سنجیدگی سے ماہنامے، دوماہی اور سہ ماہی شائع کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ پیش نظر تمام اصناف کا فروغ رہے، اور بات ہے، اور بغیر کسی پابندی وقت کے کبھی کبھی مجموعے کی شکل میں کوئی ضخیم کتاب شائع کر دینا اور بات ہے۔ پھر جدیدیت کے پیش نظر صرف کہانی اور شعری اصناف ہی رہی ہیں لہٰذا ان رسائل سے دیگر اصناف کی توقع بے سود ہی ہے۔ اس کے باوجود آزادی کے بعد تقریباً جملہ اصناف میں نئے اسالیب، نئے موضوعات اور نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ ہوا۔ ہر ایک صنف بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، ثقافتی حالات سے اثر پذیر ہوئی اور یہ اثر پذیری ہمارے ان ادبی رسائل میں شائع شدہ نثری اصناف میں نمایاں ہے۔

ذیل میں ہر صنف کے تعلق سے فہرست پیش کی جاتی ہے۔ جس میں منتخب تخلیقات درج ہیں :

ماہنامہ آج کل

ڈرامہ :

آرزو آرزو	ریوتی سرن شرما	اگست ۶۶ء
آزمائش	محمد مجیب	اگست ۵۷ء
اپنی اپنی کھڑکی	کرتار سنگھ دگل	نومبر ۶۳ء
الف لیلی کی ایک رات	سلام مچھلی شہری	مئی ۵۱ء
ترقی پسند غالب	کنہیا لال کپور	نومبر ۵۹ء
داراشکوہ	محمد حسن	اپریل ۶۴ء
کارتوس	حبیب تنویر	اگست ۶۶ء

انشائیہ نگاری

ادھر ادھر کی	رشید احمد صدیقی	فروری ۶۴ء

ادبی رسائل	شکیل اعجاز	نومبر ۸۴ء
بے ترتیب	احمد جمال پاشا	جون ۸۳ء
چارپائی اور کلچر	مشتاق احمد یوسفی	طنزومزاح نمبر
مرحوم کی یاد	پطرس	اپریل ۴۴ء

طنزومزاح

آئینے میں	یوسف ناظم	طنزومزاح نمبر
ادبی مشیر	کنہیالال کپور	جولائی ۵۶ء
ایک اکیلا تنہا	فکر تونسوی	جنوری ۸۳ء
جشن جدائی	دلیپ سنگھ	اپریل ۸۵ء
خدا کی قدرت	مجتبیٰ حسین	اگست ۷۸ء
باتیں ان کی باقی میرا	معین اعجاز	جنوری ۸۴ء

خاکے

ابراہیم جلیس کی یاد میں	مجتبیٰ حسین	جنوری ۷۸ء
بیگم مولانا محمد علی	آصفہ مجیب	نومبر ۷۱ء
فانی —— سوانحی خاکہ	عبدالشکور	ستمبر ۷۹ء
محمد علی ردولوی	ہما بیگم	مئی ۶۰ء
ایک خط بنام عرش ملسیانی	غلام رسول مہر	ستمبر ۵۷ء

خودنوشت

غبار کارواں	صالحہ عابد حسین	دسمبر ۶۹ء
ایضاً	گیان چند جین	اپریل ۷۰ء
ایضاً	عبدالماجد دریابادی	جولائی ۷۰ء
ایضاً	عصمت چغتائی	نومبر ۷۰ء
ایضاً	شمس الرحمان فاروقی	جون ۷۲ء
ایضاً	مالک رام	ستمبر ۷۲ء

سفرنامے

آدھی رات کے سورج کا دیش	ستیش بترا	اکتوبر ۸۵ء
امریکہ کے مغربی ساحل سے مشرقی ساحل تک	ایضاً	جنوری ۸۶ء
یہ واشنگٹن ہے	ایضاً	دسمبر ۸۵ء
کچھ دن المانیہ میں	صالحہ عابد حسین	جنوری ۵۵ء

"شاہراہ"

ڈرامہ

اناس اور ایٹم بم	خواجہ احمد عباس	جون ۵۱ء
انار کلی	عادل رشید	فروری مارچ ۵۲ء
دو زاویے	بلونت گارگی	اگست ۵۳ء
بابا کالے شاہ	اقبال فرحت	نومبر ۵۴ء
چچا چھکن نے تصویر ٹانگی	بیگم قدسیہ زیدی	جولائی ۵۵ء
جشن	تاجور سامری	دسمبر ۵۸ء
آدم خور	رام لعل	اپریل ۶۰ء

انشائیے

گاؤں کی سیر	اے۔ مجید	جولائی ۵۵ء
ہمارے غیر ملکی ادیب	کیدار ناتھ	ایضاً
پروفیسر نفسی اور بکری	فکر تونسوی	ایضاً
یکے از سامعین	نعیمہ شوکت	ایضاً

خاکے

بن بلائے ڈیلی گیٹ	فکر تونسوی	اگست ۱۹۵۰ء
قوس قزح	دیوندر اسّر	اگست ۱۹۵۱ء
ایک واقعہ	پرکاش پنڈت	ستمبر ۱۹۵۰ء

آزادی کے بعد	ست پرکاش سنگھ	سنگھ ۱۹۵۲ء
یہاں سب خیرت ہے	مسیح الحسن رضوی	نومبر ۱۹۵۲ء
ہدایت نامہ خاوند	اقبال وحشت اعجاز	جنوری فروری ۱۹۵۳ء

طنزومزاح

ایک خونخوار فقرہ	فکر تونسوی	اگست ۱۹۵۳ء
یونیورسٹی کے لڑکے	احمد جمال پاشا	ستمبر اکتوبر ۱۹۵۴ء
وقت کی پابندی	علی عباس حسینی	جون ۱۹۵۸ء

رپورتاژ

سیکنڈ پل	مہندر ناتھ	ستمبر ۱۹۵۱ء
پوپھٹے	خدیجہ مستور	ستمبر ۱۹۵۳ء
آزادی کی قسم	کنھیالال کپور	اکتوبر ۱۹۵۰ء
فاختہ کی اڑان	فکر تونسوی	ایضاً

"عصری ادب"

ڈرامہ :

صدابصحرا	ابراہیم یوسف	اگست ۷۷ء
ایٹی کیٹ	کمارپاشی	اکتوبر ۷۳ء
سانپ کی لاش	سلیم تمنائی	اپریل ۷۷ء
آندھی	مہدی عباس حسینی	مارچ ۱۹۵۳ء

دیگر اصناف

فراق سے انٹرویو	رتن سنگھ	اگست ۷۷ء
جیلانی بانو سے انٹرویو	ایضاً	ایضاً
مزاحیہ	یوسف ناظم	ایضاً
قسط وار طنزومزاح	نریش ندیم	جنوری ۷۹ء
شورنہ کیجئے"	یوسف ناظم	ایضاً

شہر اور آنکھیں (رپورتاژ)	شموئیل احمد	اکتوبر ۷۳ء
صاحبقراں (تمثیل)	قمر احسن	نومبر ۷۳ء

کتاب نما

سیکنڈ کلاس کا سفر (انشائیہ)	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	نومبر ۸۸ء
میاں مٹھو (انشائیہ)	جاوید وشِشٹ	مئی ۹۰ء
ہجرت (")	احمد جمال پاشا	جنوری ۸۹ء
غالب کے ازار بند سے (طنزومزاح)	یوسف ناظم	مارچ ۸۸ء
ادب برائے بندگی (")	ایضاً	جون ۸۸ء
ہم جو اپنی شرافت میں (")	دلیپ سنگھ	مارچ ۸۸ء
ارے ہاں یاد آیا	شاہد صدیقی	مئی ۹۳ء
پڑھنا اخبار کا (طنزومزاح)	وجاہت علی سندیلوی	جون ۸۸ء
بک جاتے ہیں ہم آپ	شفیقہ فرحت	مئی ۹۰ء
چار کتابوں والے "	شکیل اعجاز	جولائی ۹۱ء
ادب میں مارشل لا "	احمد جمال پاشا	جنوری ۸۹ء
خود نوشت	ایضاً	ایضاً
پیروڈی	ایضاً	ایضاً

"ایوان اردو"

چلو اکیسویں صدی (انشائیہ)	معین اعجاز	مئی ۸۷ء
دروازے (")	یوسف ناظم	جون ایضاً
شاعروں کے نرغے میں (")	احمد جمال پاشا	جنوری ۷۹ء
داڑھی (")	عظیم اقبال	جون ۸۹ء
تنکا (")	جاوید وشِشٹ	اکتوبر ۸۹ء
دوستوں کے نام (طنزومزاح)	فکر تونسوی	نومبر ۸۷ء
من کہ (")	خورشید جہاں	جنوری ۸۸ء

کیا دھوپ تھی کہ (خاکہ)		راج نرائن راز	جولائی ۸۷ء
لوٹ کے آنے کے لیے جا (رپورتاژ)		شبنم رحمٰن اکولوی	مارچ ۹۱ء
حیلہ	(ڈرامہ)	محمد ظفرالدین	نومبر ۸۸ء
۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی شام	('')	پاندی فکانوی	جنوری ۹۱ء

مذکورہ فہرست میں جو عنوانات دیے گئے ہیں وہ صرف ایک نمونہ ہیں۔ ان میں بڑے اور چھوٹے قلمکاروں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ان عنوانات سے صرف رسائل کی اشاعتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کن بڑی اصناف کو ان رسائل نے اپنی اشاعتوں میں شامل کیا۔ بعض مدیروں نے اپنے پرچوں کے ذریعے چند مخصوص اصناف کی ہی آبیار کی۔ ان کے نزدیک تخلیقی نثری ادب میں افسانہ ہی اہم قرار پایا۔ سطور' تلاش' تخلیق' معیار' شعور' محور' وغیرہ میں افسانے ہی اکثر شائع ہوتے رہے ہیں۔ البتہ اکا دکا مزاحیہ مضامین بھی تخلیق اور ذہن جدید میں شائع ہوتے رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی یہ پرچے جدید اسلوب بیان پر زور دیتے تھے۔ موضوع کی ان کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور اسلوب کے سلسلے میں جو فنی جوہر افسانے میں دکھائے جاسکتے ہیں دیگر اصناف نثر میں اس کے امکانات کم ہیں پھر بھی طنزومزاح پر کچھ مواد ان جرائد میں بھی ملتا ہے۔ شاہراہ' عصری ادب' عصری آگہی' جیسے ترقی پسند رسائل میں البتہ اصناف نثر کا تنوع دکھائی دیتا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر سماجی زندگی پر زیادہ تر تخلیقات کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ڈرامے' انشائیے' سفرنامے' طنزومزاح' رپورتاژ' افسانے' ناول غرض ہر صنف سخن کو ''آج کل'' کی طرح ترقی پسند رسائل نے بھی اہمیت دی اور اپنے صفحات کو ان کے لیے ہمیشہ کھلا رکھا۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ دہلی سے شائع ہونے والے اردو کے ادبی رسائل نے اصناف نثر کے فروغ میں خاصا اہم رول ادا کیا ہے۔

باب ششم

ادبی رسائل میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کی نوعیت اور قدر و قیمت

آزادی کے بعد اردو کی دیگر اصناف کی طرح تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسائل نے کافی پیش رفت کی اور تحقیق و تنقید کی جو روایت حالی، محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی وغیرہ سے چلی تھی اور عبدالرحمٰن بجنوری، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، نورالحسن ہاشمی، حامد حسن قادری، امداد امام اثر، مہدی افادی، رام بابو سکسینہ، نصیرالدین ہاشمی، ابواللیث صدیقی، مسعود حسین رضوی ادیب وغیرہ نے جسے اپنی سنجیدہ کوششوں سے نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں بیش قیمت اضافے بھی کیے، اس روایت کو ان رسائل نے وسیع کینوس عطا کیا اور مختلف و متنوع نئی جہات بھی بخشیں۔ آزادی کے بعد عبادت بریلوی، ابواللیث صدیقی، وحید قریشی جیسے محققین و ناقدین پاکستان چلے گئے لیکن ہندوستان میں جن لوگوں نے اس شعبے میں قابل ذکر خدمات انجام دیں اور اردو تحقیق و تنقید کو عالمی سطح پر روشناس کرانے کی کوششیں کیں۔ ان کی نگارشات دہلی کے ان ادبی رسائل کی زینت بنتی رہیں جن کا مقصد غیر تجارتی تھا۔ آزادی کے بعد اس طرح کی کوششوں کو جلا بخشنے والے بعض رسائل تو ایسے ہیں جو صرف تحقیقی و تنقیدی شعور کو صیقل کرنے کے لیے جاری ہوئے۔ ان میں انجمن ترقی اردو ہند کا مجلہ "اردو ادب" "اردوے معلیٰ" اور "تحریر" کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان خالص تحقیقی و تنقیدی رسالوں کے علاوہ "آج کل" "شاہراہ" "تحریک" "عصری ادب" "عصری آگہی" "تلاش" "تحقیق" "محور" "سطور" "کتاب نما" "ایوان اردو" اور "ذہن جدید" وغیرہ رسائل میں بھی تحقیق و تنقید پر مواد شائع ہوتا رہا ہے۔ جن میں اول الذکر پانچ رسائل نے اس سمت میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اردو کے وہ معتبر نقاد جو آزادی سے پہلے تحقیق و تنقید میں اپنا مقام بنا چکے تھے مثلاً مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، تمکین کاظمی، مالک رام، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود،

کلیم الدین احمد اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وغیرہ اور وہ علمائے تحقیق و تنقید جو آزادی کے بعد آسمان ادب پر نمودار ہوئے، دہلی کے ان ادبی رسائل میں اپنی نگارشات شائع کراتے رہے۔ اول الذکر کی نگارشات پر نمونے "آج کل" "تحریر" "اردو ادب" "اردوے معلیٰ" اور "شاہراہ" وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں جب کہ آخر الذکر یعنی محمد حسن، قمر رئیس، نارنگ، عقیل رضوی، وارث علوی، وہاب اشرفی، سری نواس لاہوتی، تنویر احمد علوی، نثار احمد فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، مجتبیٰ حسین، سبط حسن، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، سلیم احمد، جمیل جالبی، شمیم احمد، مظفر علی شیدا، نظیر صدیقی، دیویندر اسر وغیرہ کی تنقید و تحقیق کے نمونے آزادی کے بعد سے آج تک شائع ہونے والے تقریباً تمام رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔

آزادی کے وقت اردو میں ترقی پسند اصول و نظریات تنقید کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی اور یہی اس وقت کا غالب رجحان تھا۔ ادب کا ہر شعبہ اس رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا۔ دہلی تو شروع ہی سے ترقی پسندیت کا مرکز رہا ہے۔ لہٰذا یہاں سے بہت اہم ترقی پسند رسائل جاری ہوئے۔ "ساقی" اگرچہ تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا لیکن جوش ملیح آبادی کی ادارت نے "آج کل" (آزادی کے بعد) کے ابتدائی برسوں کے شماروں کو ترقی پسندی کا ترجمان بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس خلا کو پر کرنے کے لیے "شاہراہ" جو کہ خالص ترقی پسند رسالہ تھا، کا اجراء ہوا۔ ان رسائل نے ترقی پسند تنقید کو خاصا فروغ دیا۔ لیکن اپنے انتہا پسندانہ رویے کی وجہ سے بیشتر ترقی پسند نقاد اردو ادب کے بدلتے ہوئے منظرنامے پر اپنا کوئی واضح نقش نہیں چھوڑ سکے کیونکہ یہ نقاد نظریات تنقید کے نام پر صرف تاریخی و مادی جدلیت کو گھونٹتے رہے۔ اور عملی تنقید میں ان کا یہ حال تھا کہ ہر فن پارے میں سماجی معنویت کو تلاش کرتے رہے اور فن پارے کی جمالیاتی خوبیوں کو یکسر نظر انداز کرتے رہے۔ ان ترقی پسند ناقدین میں بعض اعتدال پسند اور گہرائی سے سوچنے والے ایماندار قسم کے لوگ بھی تھے اور یہی وہ نقاد ہیں جن کو کل بھی اعتبار حاصل تھا اور آج بھی ان کے تنقیدی فیصلے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید نے بلاشبہ اردو کو تنقید کا وافر سرمایہ عطا کیا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مخصوص سیاسی نظریات کی تبلیغ کے جذبے نے اس میں سے بیشتر کو غیر اہم کی صف میں رکھوا دیا۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جس سائنٹیفک تنقید کو فروغ ملا' اس کی ترجمانی اور اشاعت میں جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے "آج کل" کے علاوہ "شاہراہ" "عصری ادب" اور عصری آگہی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ "آج کل" اگرچہ حکومت ہند کا ترجمان ہونے کے ناطے غیر جانب دار رسالہ رہا لیکن مدیروں کے ادبی نظریات بہر حال اس کے مضامین سے مترشح ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس رسالے میں ہر تنقیدی نظریے کو مناسب جگہ ملی لیکن اس رسالے نے کسی ایک رجحان کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔ البتہ جس دور میں عوام کی پسند کا رخ جس رجحان کی طرف زیادہ رہا اس سے متعلق مضامین بھی زیادہ چھپے۔ کبھی ترقی پسند تنقید کو اس نے نمایاں کیا تو کبھی جدیدیتی تنقید کو اور فی زمانہ معتدل انداز جو ادب میں آیا ہے اس کا اثر اس رسالے پر بھی مرتب ہوا ہے۔ اور متوازن تنقید کو اس میں نمایاں جگہ مل رہی ہے۔ یہی حال تحقیق کا ہے۔ اس رسالے نے ہمیشہ عمدہ تحقیقی مضامین شائع کیے ہیں۔ نہ صرف ادب بلکہ دیگر فنون لطیفہ پر بھی "آج کل" میں بہترین تحقیقی مضامین چھپتے رہے ہیں۔ یوں تو اس میں ہر طرح کے مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن علمی و ادبی شخصیات کا تعارف کرانے پر خاص طور پر دھیان دیا گیا ہے۔ نظریاتی و عملی تنقید کے بہترین نمونے اس جریدے میں ہمیں ملتے ہیں اور ہر دور کے معیاری لکھنے والوں کی نگارشات اس میں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں اساتذہ بھی ہیں اور نئے قلمکار بھی۔ شاید ہی کوئی ہمعصر نامور محقق و ناقد ایسا ہو جس کی تحریریں اس رسالے کی زینت نہ بنی ہوں۔

شاہراہ' چوں کہ ادب میں مقصدیت و افادیت کا علم بردار تھا۔ لہٰذا اس میں شائع ہونے والے تنقیدی مضامین اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں کہ ادب خلا میں تخلیق نہیں ہوتا۔ اس کے سوتے اسی زمین سے پھوٹتے ہیں جس میں ادیب زندگی گزارتا ہے۔ لہٰذا اس میں ادیب کا سماجی ماحول، تعلیم و تربیت خیالات و عقائد' ملکی و بین الاقوامی سیاسی حالات غرض دنیا کی بے شمار چیزیں اس کے تخلیق کیے گئے ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اجتماعی زندگی کے کوائف اس ادب میں بہر طور شامل ہوتے ہیں۔ اس میں اجتماعی زندگی اور تہذیب و ثقافت کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کا پتہ چلائے کہ زیر نظر ادب پارہ سماج کے ارتقاء میں کتنا معاون ہے اور کتنا مضر۔ یہ نظریات مارکس کے نظریہ ادب سے مستخرج ہیں۔ اس طرح کی تنقید لکھنے والوں میں جو کہ "شاہراہ" میں برابر چھپتے

رہے محمد حسن، بدیع مشہدی، ممتاز حسین، سری نواس لاہوتی، پرکاش چند گپت، عبادت بریلوی، آل احمد سرور، کرشن چندر، فیض احمد فیض، سلامت اللہ، جاں نثار اختر، اطہر پرویز، شمیم احمد، احتشام حسین، مسیح الزماں، عابد حسن منٹو، انور عظیم، رفیع اللہ خاں عنایتی محمد عظیم، بلراج کومل، ہنس راج رہبر، قاضی عبدالغفار، بانی۔ ایم۔ اے، شکیل الرحمٰن، سید محی الدین قادری زور خاص طور پر اہم ہیں۔

"عصری ادب" اور "عصری آگہی" بھی گرچہ ترقی پسند خیالات کے مبلغ لیکن ان کے تنقیدی مضامین میں وہ کٹرپن نہیں جو "شاہراہ" کا خاصہ تھا۔ خاص طور پر "عصری ادب" اس معاملے میں کافی وسیع النظر رہا ہے۔ اس میں محمد حسن نے نئے رجحانات کو آنے کا برابر موقع دیا ہے اور دل و دماغ کے دریچے ہمیشہ وا رکھے ہیں کہ ان کی نظر میں ترقی پسندی اسی کا نام ہے۔ کیوں کہ انسان اور اس کے ذریعے تخلیق کیا جانے والا آرٹ تغیر پذیر ہے۔ اس پر جمود طاری نہ ہو۔ ان کا عقیدہ ان کے جریدے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے کبھی جانب داری یا عصبیت کو پرچے پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ "عصری ادب" کے لکھنے والوں میں محمد حسن، سمیع الحق، سری نواس لاہوتی، طارق سعید، نشاط قیصر، سلطان علی شیدا، اصغر علی انجینئر، محمد عقیل رضوی قابل ذکر ہیں۔

"عصری آگہی" میں ترقی پسند نظریات کی وکالت کے علاوہ جدیدیت کی غلط تعبیر اور ادھ کچرے خیالات کی مخالفت کی گئی ہے۔ ان شعراء کا مضحکہ اڑایا ہے جنھوں نے وجودیت کے فلسفے کو سمجھے بغیر اسے اپنی شاعری میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس رسالے کے اہم لکھنے والوں میں ساجدہ زیدی، محمد حسن، قمر رئیس، ممتاز حسین، عابد سہیل، خورشید سمیع، حیات اللہ انصاری، شہزاد منظر، کے۔ کھلر، مظہر امام، مجتبیٰ حسین، علی احمد فاطمی وغیرہ شامل ہیں۔

"تحریک نے" ترقی پسندی یا مارکسی نظریہ ادب کی تردید میں آزادی کے بعد سب سے پہلے آواز اٹھائی۔ یہ رسالہ پابندی کے ساتھ وقت پر شائع ہوتا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد اشتراکی نظام سیاست اور نظریہ ادب کی مخالفت تھا۔ لہٰذا اس میں بھی جو تنقیدی مضامین شائع ہوئے وہ تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کی وکالت کرتے ہیں۔ "تحریک" کے تنقیدی مضامین میں ادب کے جمالیاتی پہلو کو زیادہ ابھارا گیا ہے اور اس کی سماجی ذمہ داری سے انکار کیا ہے۔ اس میں

تحقیقی مضامین بھی خاصی تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے خاص لکھنے والوں میں رشید حسن خاں، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، سید وحید الدین، سہیل واسطی، گوپال متل، مخمور سعیدی، رشید احمد صدیقی، شوکت سبزواری، انور سدید، وزیر آغا، شمس طہرانی، فرحت قمر، شمس الرحمٰن فاروقی، سلیمان اطہر جاوید، حامدی کشمیری، سہیل عظیم آبادی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

"تحریر" اردو کا ایک موقر رسالہ ہے۔ جس کے بانی و مدیر مالک رام تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی ۱۹۶۷ء میں اس رسالے کا اجراء عمل میں آیا۔ اپنی ابتداء سے اختتام تک یہ رسالہ اردو میں معیاری تحقیقی و تنقیدی ادب کا اضافہ کرتا رہا۔ مالک رام خود بھی کھلے ذہن کے اور وسیع القلب تھے۔ اور ان کا جریدہ بھی تنگ نظری اور گروپ بازی سے کوسوں دور تھا۔ اس میں ہر اس محقق و ناقد کی نگارشات شائع ہوئیں جو ادب سے سنجیدہ وابستگی رکھتا ہے۔ اور جس نے تحقیق و تنقید کو بحالت مجبوری نہیں بلکہ ایمان اور عقیدے کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اسی لیے اس کے مضامین میں ایک وقار اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔ اس کے چند اہم مصنفین کے نام اس طرح ہیں۔ مالک رام، علی جواد زیدی، گوپی چند نارنگ، تنویر احمد علوی، ہنس راج گپتا، ضیاء الدین ڈیسائی، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مولانا ابوالکلام آزاد، مسعود حسن رضوی ادیب، عابد رضا بیدار، گیان چند جین، نورالحسن ہاشمی، نثار احمد فاروقی، عبداللطیف اعظمی، اسلوب احمد انصاری، محمد عمر، سجاد ظہیر، حامد حسین، عبدالقوی دسنوی، عبدالحئ، مشفق خواجہ، شانتی رنجن بھٹاچاریہ وغیرہ۔

انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے "اردو ادب" میں بھی تحقیقی و تنقیدی مضامین خصوصی طور پر شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ پہلے علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا لیکن بعد میں دہلی آگیا اور تب سے تاحال جاری ہے۔ جب علی گڑھ سے یہ جریدہ نکلتا تھا تب اس کی ادارت کے فرائض آل احمد سرور انجام دیتے تھے۔ آج کل اس کے ایڈیٹر خلیق انجم ہیں۔ اس میں معتبر محققین و ناقدین کی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی ترجمانی کرنے والے رسائل میں تنقیدی مضامین کم اور تحقیقی مضامین بالکل نہیں چھپے ہیں۔ کم از کم ہمارے سامنے موجود رسائل کے پیش نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے۔ "تخلیق" اور "تلاش" ایک ہی مدیر کی ادارت میں شائع ہوتے تھے جن

کا واضح رجحان جدیدیت کی طرف تھا۔ ان رسائل میں تنقید کے امریکی دبستان سے اثر انگیزی کے اشارات نمایاں نظر آتے ہیں۔ "تخلیق" اور "تلاش" میں جدید اسلوب کو اپنی تنقیدی نگارشات کے ذریعے عام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور کئی مضامین اسی قسم کے چھاپے گئے ہیں کہ زبان کا روایتی ڈھانچہ آج کی صورت حال کا ساتھ دینے سے قاصر ہے لہٰذا اس کی تعمیر نو ہونی چاہئے۔ عملی تنقید کے نمونے بھی بعض شماروں میں مل جاتے ہیں۔ شکیل الرحمٰن، انور عظیم، راہی معصوم رضا، عزیز الحق، افتخار جالب جیسے نقاد ان رسائل میں چھپتے رہے۔

"محور" کے اجراء کا زمانہ وہی ہے جب جدیدیت اپنے عروج پر تھی۔ لیکن جدیدیت کا ترجمان ہونے کے باوصف اس کے تنقیدی مضامین میں متنازعہ فیہ مسائل کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور عملی تنقید کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ محمود ہاشمی، وزیر آغا اور مجتبیٰ حسین اس کے خاص لکھنے والے تھے۔

"سطور" خالص جدیدیت کا ترجمان تھا اور اس تنقیدی نگارشات میں صحت مند جدید رجحانات سے استفادہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اور جدید شاعری کی اس بات پر نکتہ چینی کی گئی ہے کہ انہوں نے وجودیت اور علامتیت کو پورے طور پر نہیں سمجھا اور ادھورے علم کی بناپر شاعری کو یکسانیت سے آلودہ کررہے ہیں۔ ان کے مضامین سماج سے یکسر بے نیاز ہونے پر بھی شاعروں اور ادیبوں کی گرفت کرتے ہیں نیز آئیڈیولوجی کی بحث کو سرے سے ختم کیے جانے پر بھی ان میں ناگواری کا اظہار کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ "سطور" کے مدیر کمار پاشی جدیدیت کے نام پر مہمل گوئی، اور بے راہ روی کی مخالفت کرتے ہوئے جدید ادب کی صحیح راہ کا تعین کرنے کی کوشش اس رسالے کے ذریعے کرتے رہے۔

"معیار" مابعد جدیدیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لیے نہ خالص سماجی حقیقت نگاری پر ایمان رکھتا ہے اور نہ محض جمال پرستی کو اس نے فروغ دیا ہے۔ بلکہ ایک ایسے انداز تنقید کو عام کرنے کا کام اس کتاب نما رسالے نے کیا ہے جو بیک وقت ترقی پسند بھی ہے اور جدید بھی۔ اس نے ان اصولوں کی وکالت کی ہے جو ادب کو فن کے مرتبے پر برقرار رکھتے ہوئے اسے انسان کی داخلی وخارجی وانفرادی زندگی کا عکاس بناسکے۔ اس میں عتیق اللہ، قمر احسن، وارث علوی، گوپی چند نارنگ، فراق گورکھپوری وغیرہ کی تنقیدی نگارشات شائع ہوئی ہیں۔

"تناظر" اور "ذہن جدید" کا بھی وہی مزاج ہے جو "معیار" کا ہے۔ زبیر رضوی نے جس طرح اعتدال کو اپنا شعار بنایا ہے ان کا یہ رسالہ ذہن جدید بھی اس روش پر گامزن ہے۔ اس میں جن قلمکاروں کی تنقیدی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں ان میں باقر مہدی، جمیل جالبی، وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، آصف فرخی، شموئیل احمد، شمیم احمد، ناصر بغدادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"کتاب نما" اور "ایوان اردو" کو کسی بھی رجحان یا گروپ کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا، "کتاب نما" اور "ایوان اردو" میں معیاری تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں اور ان پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ لہٰذا دونوں رسالوں میں ترقی پسند اور جدیدیت کے طرف دار سبھی کے مضامین یکساں طور پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد، بلراج کومل، جمیل جالبی، عبدالمغنی، عزیز الحق جعفری، ابراہیم یوسف، ابوسلیمان شاہجہاں پوری، ارتضیٰ کریم، اسعد بدایونی، ظ۔ انصاری، محمد ضیاء الدین انصاری، جاوید ششٹ، سید حامد حسین، حبیب الرحمٰن نیازی، خالد اشرف، خالد علوی، رشید حسن خاں، کاظم علی خاں، مسعود حسین خاں، خورشید انور، کالی داس گپتا رضا، رفعت سروش، زاہدہ زیدی، ابوالفیض سحر، سلام بن رزاق، صالحہ عابد حسین، عظیم الشان صدیقی، ضمیر حسن دہلوی، عابد سہیل، سید عبدالباری، عبدالستار دلوی، عبدالماجد دریابادی، امتیاز علی خاں عرشی، خواجہ احمد فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، سید فضل امام، قرۃ العین حیدر، قمر رئیس، قیصر سکندر، گیان چند جین، محمد حسن، مالک رام، مخمور سعیدی، مشیر الحق، مظہر امام، مظفر حنفی، شمیم حنفی، رام لال، منصور عالم، حکم چند نیر وغیرہ اہم ہیں۔

آزادی کے بعد دہلی سے جاری ہونے والے اردو کے مذکورہ بالا ادبی رسائل میں شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے بارے میں عمومی اندازہ لگانے کے لیے کچھ مثالیں ان رسائل سے اخذ کر کے پیش کردی جائیں۔ لہٰذا ہر رسالے کے چند نمائندہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"آج کل"

شمارہ فروری ۱۹۴۹ء میں گیان چند جین کا تحقیقی مضمون "قصہ گل بکاؤلی کی تاریخ اور ماخذ" میں معتبر حوالوں کی روشنی میں قصہ گل بکاؤلی کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور قصے

کے ماخذ پر بحث کی ہے۔ سید احتشام حسین کے متعدد مضامین "آج کل" میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کا مضمون "پریم چند کی ترقی پسندی" شمارہ مارچ ۱۹۴۹ء ایک معرکتہ الآرا مضمون ہے۔ جس میں موصوف نے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کے رجحان کی تشریح کر کے اسے ترقی پسندی کی تعریف سے ہم آہنگ کیا ہے۔

خواجہ احمد فاروقی بھی اس رسالے میں کثرت سے چھپتے رہے ہیں۔ ان کا مضمون "ذکر میر خود نوشت کی حیثیت سے" (شمارہ اگست ۱۹۵۰ء) اعلیٰ تنقیدی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ خواجہ صاحب نے میر پر کافی وقیع کام کیا ہے۔ اس لیے انہیں ماہر میر بھی کہا جاتا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ذکر میر کو میر کی خود نوشت سوانح کی حیثیت سے پرکھا ہے اور مختلف مثالوں کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ "ذکر میر" میں میر تقی میر کی زندگی کے حالات، شخصیت اور شاعری سبھی کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور میر سے متعلق جو مسلمات آج تک چلے آرہے ہیں مثلاً میر بہت قناعت و توکل پسند آدمی تھے، کو غلط قرار دیا ہے۔

مسعود حسن رضوی کا ایک تحقیقی مضمون "رائے ٹیکارام" (شمارہ اگست ۱۹۴۹ء) ٹیکارام اور ان کے کام کے بارے میں مستند معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس مضمون میں ٹیکا رام "تسلی کی تصانیف مثلاً دو دیوان (ایک فارسی اور ایک اردو)" انشاء کی دو کتابیں فارسی نثر میں) اور ایک قصہ اردو وغیرہ پر خاطر خواہ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ انہی کا ایک اور مضمون "فائز دہلوی شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر" شائع ہوا ہے جو کہ تحقیق و تنقیدی دونوں نوعیتوں کا حامل ہے۔ موصوف نے اس مضمون میں فائز دہلوی کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان اردو شاعر مانا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فائز دہلوی کی تصانیف، خطوط، حالات زندگی اور فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

فروری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں مالک رام کا مضمون میری پسند کی اردو کتابیں شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی پسند کی اردو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ شروعات ناول اور افسانوں سے کی ہے اور اس سلسلے میں تمام اہم ناول و افسانہ نگاروں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ "فسانہ عجائب" "فسانہ آزاد" وغیرہ کے ذکر کے ساتھ ڈپٹی نذیر احمد، شرر، راشد الخیری، پریم چند وغیرہ سبھی کے انداز بیان پر روشنی ڈالی ہے۔ سوانح، مزاحیہ ادب، تنقید، تذکرے، خطوط وغیرہ پر بھی

انہوں نے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

عبدالماجد دریابادی کا مضمون "ترانہ شوق" (ستمبر ۱۹۵۰ء) بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں شوق قدوائی کے فن کا جائزہ ان کی مثنوی "ترانہ شوق" کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

عبادت بریلوی کا مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد" (جنوری ۱۹۵۰ء) شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے مولانا آزاد کی پیدائش، تعلیم و تربیت، سیاست میں ان کا ورود وغیرہ موضوعات پر بڑے اچھے انداز میں معلومات فراہم کی ہیں اور کوئی بھی گوشہ مولانا کی زندگی کا نہیں چھوڑا ہے۔

"نئی اردو نثر کے ابتدائی نمونے" یہ مضمون برج موہن دتاتریہ کیفی کا ہے جو جنوری ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے "باغ و بہار" "آرائش محفل" اور "گل بکاؤلی" پر لکھا ہے اور تینوں کتابوں میں پائی جانے والی مماثلت کی نشاندہی کی ہے۔

اختر اورینوی کا مضمون "تنقید اور قدروں کا مسئلہ" (جولائی ۱۹۴۵ء) ایک فکر انگیز مضمون ہے۔ جس میں ادبی قدروں کی تغیرپذیری سے بحث کی گئی ہے۔

"آج کل" کے کچھ اور تحقیقی و تنقیدی مضامین کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

اردو ادب میں جدید ترین رجحانات اور ان کا تجزیہ	خلیل الرحمٰن اعظمی	اپریل ۱۹۵۳ء
آج کا اردو افسانہ	احتشام حسین	جون ۱۹۵۷ء
ادب اور صحافت	محمد احسن فاروقی	اگست ۱۹۴۹ء
ادبی تنقید اور نفسیات	محمد حسن	اکتوبر ۱۹۸۴ء
آتش کے بعض غیر معروف شاگرد	کاظم علی خاں	جولائی ۱۹۸۲ء
اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی ایک پراسرار شخصیت ابو طالب لندنی	عتیق صدیقی	مئی ۱۹۷۹ء
ادب اور غیر ادب	ممتاز حسین	مارچ ۱۹۸۶ء
اردو ادب میں کلیم الدین احمد کا مقام	عبدالمغنی	مئی ۱۹۸۴ء
اردو املا کا مسئلہ	رشید حسن خاں	اپریل ۱۹۷۲ء

اردو شاعری میں ایہام گوئی	مولوی عبدالحق	اگست ۱۹۶۱ء
اردو شاعری میں انیس کا اثر	شمس الرحمٰن فاروقی	جون ۱۹۷۵ء
اردو نظم کا مستقبل	گوپی چند نارنگ	ستمبر ۱۹۵۵ء
اقبال اور آرزو کے نایافت نسخے	امتیاز علی خاں عرشی	نومبر ۱۹۷۷ء
اقبال اور عالمی ادب	کلیم الدین احمد	نومبر ۱۹۷۷ء
تحقیق و تنقید کا باہمی رشتہ	وہاب اشرفی	جولائی ۱۹۸۴ء
ٹیگور کے مختصر افسانے	قمر رئیس	مئی ۱۹۶۱ء
جدید غزل میں علامت نگاری	عنوان چشتی	مارچ ۱۹۷۸ء
جمیل مظہری	مالک رام	اگست ۱۹۸۲ء
جہان غالب	قاضی عبدالودود	فروری ۱۹۷۳

"شاہراہ"

جنوری- فروری ۱۹۴۹ء کے شمارے میں ممتاز حسین کا ایک مضمون "نئی اور پرانی شاعری کا فرق" شائع ہوا ہے- جس میں اس نے فلسفیانہ انداز میں نئی اور پرانی شاعری کا فرق وضاحت سے سمجھاتے ہوئے ترقی پسند شاعروں کو کلاسیکی شاعری سے استفادہ کرنے کی تلقین کی ہے-

سری نواس لاہوتی کے مضمون "ابدیت حقیقت" (جنوری- فروری ۱۹۵۱ء) میں حقیقی ادب میں ابدی عناصری کی تلاش کرنے والے افراد کی تردید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ حقیقی ادب کا مقصد سماج کی ترجمانی ہے- اور چوں کہ سماجی قدریں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں لہٰذا ادب میں ایسے عناصر کی تلاش جو ہمیشہ جاری و ساری ہوں مادی جدلیت کے منافی ہے-

ہنس راج رہبر کے مضمون "ادب اور سیاست" دسمبر ۱۹۵۹ء میں ادب اور سیاست کے گہرے رشتے کی وضاحت اور ترقی پسند ادیبوں کے غلط رجحان کی نشاندہی کی گئی ہے-

جلد ۱ شمارہ ۲ میں پرکاش چندر گپت کے مضمون "ترقی پسند تنقید کے اصول" میں ترقی پسند تنقید کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ ترقی پسند نقاد جو مواد کو فن پر ترجیح دیتے ہیں بڑی غلطی پر ہیں- موضوع اور فن کا گہرا تعلق ہے- بغیر احساس کے کوئی

فن پارہ جامع اور منفرد نہیں ہو سکتا۔

جلد ۱ شمارہ ۳-۴ میں عبادت بریلوی کا مضمون "اردو شاعری کے جدید رجحانات" شائع ہوا ہے۔ یہ ایک معلوماتی مضمون ہے۔ اس میں جدید اردو شاعری جس کی ابتدا حالی اور محمد حسین آزاد کے ذریعے ہوئی قومی اور ملی شاعری تھی اور روایت سے انحراف پر مبنی تھی جس نے آگے چل کر اردو شاعری کو نئے نئے موضوعات دیئے جو کہ اردو شاعری کی عظمت کا اعلانیہ ہیں۔

"نظیر کی عوامی شاعری پر چند خیالات" یہ مضمون آل احمد سرور کا ہے جو جلد ۱ شمارہ ۳-۴ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں نظیر اکبر آبادی کے مخصوص عناصر انسان دوستی' آزاد منشی اور ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔

کرشن چندر کے مضمون "اردو کا جدید سرمایہ ادب افسانہ و ناول" (جلد ۱ شمارہ ۳-۴) میں اردو افسانہ اور جدید ناول کا سرسری جائزہ ہے جس میں پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کرتے ہوئے ان کی حقیقت پسندی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

جلد ۲ شمارہ ۸ میں ممتاز حسین نے اپنے مضمون "ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق" میں ماضی کے ادب عالیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈیموگاگی کی اہمیت اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔

سری نواس لاہوتی کے مضمون "خدیجہ مستور" کے افسانے (جلد ۲ شمارہ ۹) میں "انتظار سحر" کی روشنی میں خدیجہ مستور کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی نمایاں خوبی ہندوستان کے نچلے طبقے کی زندگی کا پر اثر بیان ہے۔

کرشن چندر کا مضمون "غلام ربانی تاباں کی نظمیں" عملی تنقید کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ تاباں کی شاعری کا آغاز عشقیہ عناصر سے ہوا لیکن انہوں نے اجتماعی غم سے آشنا ہو کر آفاقیت کا روپ اختیار کر لیا۔

ڈاکٹر سلامت اللہ نے اپنے مضمون "ادبی تنقید" (فروری ۱۹۵۱ء) میں اردو ادب کی تنقید کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اردو تنقید چند جملوں سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔

پروفیسر محمد حسن نے اپنے مضمون "جدید اردو شاعری" (جلد ۳ شمارہ ۲-۳) میں جدید اردو شاعری پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جدید شعراء کے یہاں تلخی، الجھن اور خود سپردگی کے عناصر عام ہونے کے سبب سے بڑی وجہ خارجی دنیا کے سنگین حقائق ہیں۔

جاں نثار اختر کا مضمون "جلال و جمال" (شمارہ اپریل مئی ۱۹۵۱ء) احمد ندیم قاسمی کے مجموعہ کلام "جلال و جمال" کی غزلوں، نظموں اور ان کے فنی نظریات پر تبصرہ ہے۔

شمارہ جولائی ۱۹۵۱ء میں بدیع مشہدی کا مضمون "وجود پرستی کا فلسفہ اور اس کا طبقاتی مفہوم" ایک عالمانہ مضمون ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ذہنی آزادی اور خود پسندی کے خواہاں دراصل بورژوا نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین کا مضمون "انشاء اللہ خاں انشاء" (شمارہ مارچ ۱۹۵۵ء) عملی تنقید کا شاندار نمونہ ہے جس میں انہوں نے انشاء کی شاعرانہ خصوصیات پر تنقید کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تاثیر اور موضوعاتی تنوع دونوں اعتبار سے اردو شاعری میں انشاء کا اہم مقام ہے۔

مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارے میں عابد حسن منٹو کا مضمون "مذہبی ادب کا مسئلہ" شامل ہے جس میں انہوں نے مذہبی افکار کی نشاندہی اور خارجی حالات کے پیش نظر مذہبی عناصر کی ادب میں تشکیل کی وضاحت کی ہے۔

انور عظیم کا مضمون "ایک ناقابل فراموش افسانہ نگار" (اپریل ۱۹۵۵ء) منٹو کی افسانہ نگاری پر بہترین تبصرہ ہے۔ اس مضمون میں مصنف کہتا ہے کہ منٹو ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہے۔ اس کی یہ حقیقت نگاری معاشرے کی غلیظ اور پراگندہ زندگی کے بیان پر مشتمل ہے۔ نقاد اس کو فحش نگار کہتے رہے لیکن وہ آخری دم تک انسانوں کی ذہنی پرتیں کھولتا رہا۔

ہنس راج رہبر نے اپنے مضمون "جوش کی شاعری اور انقلاب" (جنوری ۵۴ء) میں علی سردار جعفری کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ جوش بہت بڑا انقلابی شاعر ہے مصنف کا خیال ہے کہ جوش انقلابی شعور سے ناآشنا ہے۔ ان کی انقلابی شاعری میں سطحیت اور کھوکھلا پن ہے۔

شمارہ فروری ۱۹۵۹ء میں قاضی عبدالغفار کا مضمون "مولانا آزاد کی نفسیات ان کے ادب کے آئینے میں" شامل ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحب نے مولانا آزاد کی شخصیت کا

تجزیہ کر کے ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

"تحریک"

اس رسالے کے بیشتر مضامین ترقی پسند ادیبوں اور ان کے نظریات کی مخالفت پر مبنی ہیں۔

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون "دست صبا پر ایک نظر" (مئی ۱۹۵۴ء) میں فیض کی غزلوں کی خامیوں کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فیض کی غزلوں میں سب سے بڑا عیب یہ نظر آتا ہے کہ وہ قدرت کلام اور حسن بیان جس سے غزل، غزل بنتی ہے، مفقود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا لہجہ گوارا ہے اور مترنم بھی ہے لیکن غزل کے لیے یہ چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اولین چیز قوت بیان ہے۔ جس کے نہ ہونے سے اثر عنقا ہو جاتا ہے۔

نومبر ۱۹۵۷ء میں قاضی عبدالودود کا مضمون "دردو شاد" شامل ہے۔ جس میں انہوں نے "دردو شاد" پر تنقیدی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

جون ۱۹۶۰ء میں مالک رام کا مضمون "مولانا فضل حق خیر آبادی" شائع ہوا۔ جس میں فضل حق کی پیدائش اور ان کے حالات زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضمون کافی معلوماتی ہے۔

ڈاکٹر سید وحید الدین کا مضمون "غالب کا نظریہ حیات" (اپریل مئی ۱۹۶۱ء) بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں موصوف نے غالب کے نظریہ حیات پر عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ غالب پر جاری کیے گئے اس خصوصی نمبر میں قاضی عبدالودود کے بھی دو مضامین شامل ہیں۔

اکتوبر ۶۳ء میں رشید حسن خاں کا مضمون "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ جس میں موصوف نے ادب کی تاریخ کی خصوصیات اور علی گڑھ تاریخ ادب پر اظہار خیال کیا ہے۔

"تحریک" میں شائع ہونے والے کچھ اور تحقیقی و تنقیدی مضامین اس طرح ہیں۔

فارسی عطف و اضافت	سہیل واسطی	جنوری ۱۹۶۶ء
اردو اور کانگریس	گوپال متل	مئی ۱۹۶۵ء
اردو کی غنہ آوازیں	شوکت سبزواری	اکتوبر ۱۹۶۶ء
کتابوں کی مصیبت	وزیر آغا	جولائی ۱۹۷۵ء
ادب کے بنیادی عناصر اور محرکات	شمس طہرانی	جون ۱۹۷۵ء

ادب اور مقصدیت	انور سدید	جون ۱۹۷۵ء
خطوط غالب کی ترتیب نو	مالک رام	ایضاً
جدید ادبی تنقید	شمس الرحمٰن فاروقی	مارچ ۱۹۷۶ء
ناسخ کے دفتر پریشاں کا بیش قیمت مسودہ	امتیاز علی خاں عرشی	سلور جبلی نمبر

"تحریر"

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲ علی جواد زیدی کا مضمون "اتر پردیش میں نعت گوئی" کافی محنت سے لکھا گیا ہے، جس میں زمانہ ابتداء سے موجودہ دور تک کے ان نعت گو شعراء کا تعارف اور ان کے نعتیہ کلام پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

اسی شمارے میں بنسی لال گپتا کا مضمون "ڈوگری زبان" ایک لسانی تعارف اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ڈوگری زبان جو کہ ایک کوہستانی زبان ہے پر مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے اثرات کی نشاندہی اس مضمون کے ذریعے ہوتی ہے جو اردو کے قارئین کے لیے مفید ہے۔

"دسویں صدی ہجری کا ایک اردو کتبہ" یہ مضمون بھی اسی شمارے میں شامل ہے۔ جس کے مصنف ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی ہیں۔ موصوف نے اس مضمون کے ذریعے اردو کی قدامت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مضمون "اسلامیات کا مطالعہ" جلد نمبر۲ شمارہ نمبر ۱، مالک رام کا: "مولانا ابوالکلام آزاد" گوپی چند نارنگ کا: "مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس" اور جلد نمبر۲ شمارہ نمبر۳ کا مضمون "کلیات تواریخ" مصنفہ نورالحسن ہاشمی بیحد معلوماتی مضامین ہیں اور محققین کی اعلیٰ تحقیقی کاوشوں کا غماز ہیں۔

۱۹۷۰ء میں جو مضامین اس رسالے میں شائع ہوئے ان میں "تذکرۂ صدر الدین

آزردہ" (مختار الدین احمد)، "چیستان جرائت" (مالک رام) "دیوان حافظ کا ایک نادر مخطوطہ" (پروفیسر نذیر احمد)، "حاتم کی مثنوی حسن و دل" (گیان چند جین)، "احسان، غالب، ذکاء کے قطعات" (مالک رام) وغیرہ اردو تحقیق میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔

۱۹۷۰ء کے مختلف شماروں میں ہر موضوع پر ہمیں ادبی، تنقیدی اور تحقیقی نوعیتوں کے حامل مضامین نظر آتے ہیں۔ ان میں پروفیسر گیان چند جین کا مضمون "خودنوشت دیوان غالب" اور "مراثی ریختہ" (مسعود حسن رضوی)، "دیوان عبداللہ خاں جتلا (ڈاکٹر نعیم احمد)۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اکبر حیدری کا مضمون "تذکرہ بہار بے خزاں" اور ڈاکٹر اکمل ابو علی کا "اردو پر ترکی زبان کے اثرات" بے حد دلچسپ اور مفید مضامین ہیں۔

۱۹۷۱ء میں تحقیقی و تنقیدی مضامین بڑی تعداد میں لکھے گئے ان میں نثار احمد فاروقی کا "غالب اور تذکرۂ بحر ذخار" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

۱۹۷۲ء میں بھی اس رسالے میں تحقیقی مضامین خاصی تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں رضیہ سجاد ظہر کا "پریم چند ماضی اور حال کا ادیب" خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مختلف مثالوں کے ذریعے پریم چند کو ماضی و حال کا ادیب قرار دیا ہے۔

سید محمد شرف الدین ساحل کا تصنیف کردہ مضمون "ناگپور کے اخبار و رسائل" بھی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے ذریعے اردو دنیا کے ایک اہم خطے کی ادبی صورت حال کا علم ہوتا ہے۔ عابد رضا بیدار کا مضمون نقد و نظران کے گہرے تنقیدی شعور کا غماز ہے۔

۱۹۸۲ء ہی میں جوش ملسیانی پر خصوصی نمبر نکالا گیا جس میں جوش ملسیانی کی زندگی اور شاعری سے متعلق مختلف محققین و ناقدین کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں خواجہ غلام السیدین پر بھی ایک خصوصی نمبر شائع ہوا۔ یہ جولائی ۱۹۷۳ء کا شمارہ ہے۔

۱۹۷۷ء میں ضیاء فتح آبادی نمبر شائع کیا گیا جو موصوف کے بارے میں اہم معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ جولائی کا شمارہ تھا۔ اسی شمارہ میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا مضمون "پدماوت اردو" اہم تنقیدی مضمون ہے۔

رسالہ "تحریر" دہلی میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ تھا اور اس کو جاری رہنا چاہیے تھا لیکن افسوس اس بار گراں کو اٹھانے کی یا تو کسی میں ہمت نہیں ہوئی یا مالک رام نے اسے

کسی کو سپرد نہیں کیا۔ بہر حال "تحریر" سے اردو تحقیق و تنقید کو جو مستقبل میں فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس رسالے کے بند ہونے سے وہ محروم ہو گئی۔

عصری ادب

"عصری ادب" ایک سنجیدہ رسالہ ہے اور معیاری تنقیدی مضامین اس کے ہر شمارے میں مل جاتے ہیں۔ اس کے بعض اہم مضامین اس طرح ہیں :

"نئی جہت کی تلاش" (محمد حسن : اپریل، جون ۱۹۷۰ء) میں گزشتہ دس برسوں کے شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے اور ادب کی مجموعی صورت حال پر نظر ڈالی گئی ہے۔ سردار جعفری مخدوم محی الدین، پروفیسر شاہدی، کیفی اعظمی، اختر الایمان، شاذ تمکنت، شہریار، شہاب جعفری، وحید اختر، عمیق حنفی، باقر مہدی، منیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اعظمی، ندا فاضلی، راہی معصوم رضا، محمد علوی، مظفر حنفی، امیر عارفی، نریش کمار شاد اور حسن کمال کی شاعری پر اجمالی طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور حوالے کے طور پر فراق، جذبی، مجروح، فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، ناصر شہزاد، ظفر اقبال، مخدوم محی الدین، جمیل مظہری، اختر انصاری، ساغر نظامی، روش صدیقی، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور سکندر علی وجد کے فن پر اظہار رائے کیا گیا ہے۔

"آگ کا دریا۔ ایک اور نقطۂ نظر" (نشاط قیصر : مئی تا اگست ۱۹۷۷ء) میں "آگ کے دریا" پر جارحانہ تنقید کرتے ہوئے نشاط قیصر نے بتایا کہ اس ناول میں جس کردار کو آدرش بنا کر پیش کیا گیا ہے "وہ ایک مخصوص طبقے تک محدود ماضی سے لپٹا ہوا ہے۔ اس ماضی سے الگ ہو جانے پر بلکتا سسکتا، **پھپھک پھپھک** کر روتا ہوا، شکست خوردہ ذہنیت کا حامل، خود ترحمی کا شکار، صورت حال کو جیوں کا تیوں قبول کرنے والا، بدلے ہوئے ناگزیر حقائق کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رکھنے والا نیز مسائل و مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے۔" ص۔۵۳ ---------صاحب مضمون کے مطابق اس ناول کا مقصد جاگیردارانہ نظام کے لیے قارئین کے اندر جذبۂ ہمدردی پیدا کرنا ہے۔

"اردو میں احتجاجی ادب" (محمد حسن، مئی تا اگست ۱۹۷۷ء)

اس مضمون میں احتجاج کو نا آسودگی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جب موجودہ

نظام سے کوئی حساس طبیعت برگشتہ اور نا آسودہ ہوتا ہے تو احتجاج پیدا ہوتا ہے۔ احتجاج صرف غم و غصے یا ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتا ہے وہ سماج کو بدل نہیں سکتا۔ اردو میں یہ روایت جعفر زٹلی سے شروع ہوتی ہے اور سودا، نظیر، انشاء، اکبرالہ آبادی، سے ہوتی ہوئی سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، اقبال، جوش، اختر شیرانی تک پہنچی ہے اور احتجاج کی یہ آواز انگارے کے مشملات میں مزید تیز ہو جاتی ہے۔ اسی روایت کے پاسدار راشد، منٹو، عصمت، سردار جعفری، فیض، کرشن چندر، اختر معین رائے پوری، اختر الایمان، بلراج مین را، اقبال مجید، احمد ہمیش، عادل منصوری، شہریار، ندا فاضلی بھی رہے ہیں۔

"ادبی تاریخ کی تشکیل نو" (محمد حسن، جنوری تا اپریل ۱۹۸۸ء)

اردو زبان کی تشکیل سے متعلق نئی معلومات فراہم کرتے ہوئے اسے بین الاقوامی تہذیب کی ترجمان زبان قرار دیا ہے اور اس کی ابتداء مسلم حملہ آوروں سے بہت پہلے قرار دی ہے۔ نیز ہندوستان میں اردو ادب کی تاریخ کو ہندی کی طرح ابتدائی رزمیہ، بھکتی اور جدید ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

"شعر کا لسانی ڈھانچہ" (سمیع الحق : اکتوبر ۷۹ء تا جنوری ۸۰ء)

اس میں شاعری اور عام بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے مختلف بتاتے ہوئے نظم و نثر کی تفریق کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور شعر کی زبان اور تخلیق عمل پر اجمالی طور پر اظہار خیال کرنے کے بعد عروضی بحث شروع کر دی ہے۔ جس کا مقصد شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب "عروض، آہنگ اور بیان" کی تنقیص کرنا ہے۔ مصنف نے فاروقی کے وضع کردہ عروضی اصولوں کی تردید بڑے جارحانہ انداز میں کی ہے۔

"اردو صحافت کا ارتقاء" (علی جواد زیدی : جولائی۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء)

اس مضمون میں مصنف نے "جام جہاں نما" سے آج تک کی اردو صحافت کی تاریخ کو مختصراً بیان کیا ہے۔ جس میں اخبارات کا مختصر لیکن مکمل تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے کافی تحقیق کے بعد اردو صحافت پر مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

"ابدیت اور ادبیت" (سری نواس لاہوتی : جولائی، اکتوبر ۱۹۷۶ء)

اس مضمون میں قدروں کی ابدیت سے انکار کیا گیا ہے اور مارکس و لینن کے اقوال کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قدریں خواہ سماجی ہوں یا اخلاقی، ادبی ہوں یا تہذیبی تغیر پذیر

ہوتی ہیں۔ چونکہ کوئی حقیقت غیر منقسم نہیں اس لیے قدریں بھی آفاقی اور دائمی نہیں۔ علم سائنس کو آگے بڑھاتا ہے اور سائنس کے فیصلے آخری نہیں ہوتے۔ اس میں آگے کی تلاش کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ایک ثابت شدہ حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف پیش قدمی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس مضمون کی بنیاد جدلیاتی مادیت ہے۔

"نظریہ رس اور جمالیات" (طارق سعید : جولائی ۱۹۷۹ء)

اس مضمون میں سنسکرت اور ہندی کتب کی مدد سے رس یا تاثر پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تمام رسوں کا عام فہم انداز میں تعارف کرانے کے بعد اردو شاعری سے ان کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اور بتایا ہے کہ شعری فن پارے میں جمال پیدا کرنے میں تاثر یا رس کی کیا اہمیت اور رول ہے۔ یہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔

"کلیدی مقالہ" (محمد حسن، اکتوبر ۷۸ تا جنوری ۱۹۷۹ء)

کلکتے کے ایک سیمینار میں پڑھے گئے اس مقالے میں پروفیسر حسن نے ترسیل کے راستے میں حائل دشواریوں کا ذکر کیا ہے اور جدیدیت کے مبہم پیرایہ بیان اور تجربہ پسندی پر سخت تنقید کی ہے۔ موصوف فن کار کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ زندگی کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے اور سماج میں صحت مند تبدیلی لانے میں اپنی کوششوں کا استعمال کرے۔ اپنی عقل اور تجربے پر بھروسہ کرے۔ دوسروں کے فراہم کردہ انسان دشمن فلسفوں کے رعب میں نہ آئے کیوں کہ وہ استحصالی طاقتوں کے ایجاد کردہ ہیں۔

"آزادی اور تخلیقی ادب" (ڈاکٹر سلطان علی شیدا۔ اکتوبر ۷۸ تا جنوری ۷۹ء)

فلسفے اور نفسیات کی مدد سے آزادی کا مفہوم بیان کرنے کے بعد اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ روایت یا جدید تجربوں سے ضرورت بھر استفادہ کرنا تو ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ کوئی مکمل نمونہ ہمارے سامنے آگیا ہے اور ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے شعور و فکر کی آزادی سلب ہونے یا کیے جانے کا ضامن بن سکتا ہے۔

"مارکسزم ادب یا جمالیات اصغر علی انجینیر" اکتوبر ۷۸ تا جنوری ۷۹ء)

مارکس ہیگل، سارتر، کامو، کانٹ، لوکاچ، بریخت، مایافسکی، وغیرہ کے بیانات کی مدد سے اشتراکی فلسفہ جمالیات اور ادب سے اس کے تعلق پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

"جدید تر افسانہ" (سید محمد عقیل رضوی، جنوری تا اپریل ۸۹ء)

اس مضمون میں پریم چند کے افسانوی اسلوب کی اتباع کو ہر افسانہ نگار کے لیے فرض عین بتایا گیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جدیدیوں نے پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری کی اس روایت کو قتل کر دیا جس کو ترقی پسندوں نے اپنے خون جگر کی قیمت پر آگے بڑھایا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس امر پر بغلیں بھی بجائی ہیں کہ جدیدیت کے ساتھ علامتی پیرایہ اظہار کی موت ہو گئی۔ اور جدید تر افسانے میں کہانی پن لوٹ آیا ہے۔

"عصری آگہی"

اس رسالے میں مارکسی تنقید کے معیاری نمونے ملتے ہیں۔ چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

"فکشن کی تنقید اور اس کے تناظرات" (ساجدہ زیدی جلد ۲ شمارہ ۴) میں مارکسی نظریے اور وجودیت کے نظریے کو واضح کرتے ہوئے فکشن کی تنقید میں ان کے غلط استعمال کی نشاندہی اور ایسے معیارات وضع کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے جن سے فن کی سحر آفرینی اور اس کی جمالیات کے اجزائے ترکیبی تک رسائی حاصل ہو سکے۔

پروفیسر ممتاز حسین کے مضمون "افسانے میں کہانی پن کا عنصر" (جلد ۲ شمارہ ۷) میں جدید افسانے کی نامقبولیت کے اسباب کی تلاش مختلف افسانہ نگاروں کے خیالات کی روشنی میں کی گئی ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ افسانے میں کہانی پن کیا ہوتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نمبر (اگست ۱۹۸۲)

اس شمارے میں بیدی کے فکر و فن اور شخصیت و خدمات پر مقتدر قلمکاروں کے مضامین اور بیدی کے نمائندہ افسانوں کے علاوہ ان کی کہانیوں کے تجزیے شامل ہیں۔

عظیم الشان صدیقی کے مضمون "جدید افسانوی ادب اور ماضی کی بازیافت (جلد اشمارہ ۲) میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ اور جمہوری نظام کے اثرات کا افسانے میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ معاشرہ کس طرح بدلتا گیا اور یہ بھی بتایا ہے کہ افسانے میں تبدیلی کے لیے کیا ہو رہا ہے۔

"مارکس، اینگلز اور نظریہ جمالیات" (جارج لوکاچ رعبدالحئ جلد اشمارہ ۲) میں مارکسی جمالیات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے نیز مارکسزم کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے۔

"پریم چند اور فرقہ واریت" (جلد ا شمارہ ۳) ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند پر لگائے گئے کٹر ہندویت اور فرقہ واریت کے الزام کی تردید کی ہے۔ یہ الزامات انتظار حسین نے عائد کیے تھے۔

ڈاکٹر قمر رئیس کے دو اور مضمون علی الترتیب "ندی۔ایک تجزیہ" اور "یادوں کی گزر گاہ" شائع ہوئے۔ اول الذکر میں سلام بن رزاق کی کہانی "ندی" کا تجزیہ کیا گیا ہے اور آخر الذکر میں فکر تونسوی سے ایک گفتگو اور ان کے حالات زندگی شامل ہیں۔

جلد ا شمارہ ۴ میں مظہر امام کا ایک مضمون "ترقی پسندی سے جدیدیت تک" شائع ہوا۔ جس میں موصوف نے جدیدیت کے مفہوم کی وضاحت کی ہے اور اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع یا رد عمل ہے۔ کچھ اور مضامین اس طرح ہیں :

مشتاق احمد یوسفی۔ایک تاثر	مجتبیٰ حسین	ج ا ش ۵۴
افسانوی ادب اور اس کی تنقید	عابد سہیل	ایضاً ۶
کچھ تخلیق شعر کے باب میں	ساجدہ زیدی	ایضاً ۱۱
ادب کا سماجی کردار	خورشید سمیع	ایضاً

"تخلیق"

"پریم چند کا ایک افسانوی کردار" (شکیل الرحمٰن، نومبر ۱۹۶۱ء)

اس مضمون میں پریم چند کے افسانے "بازیافت" کی مرکزی کردار ایک عورت کی داخلی کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے پریم چند کی کردار نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ پریم چند نے جہاں کرداروں کے خارجی رویے کی کامیاب تصویر کشی کی ہے وہیں ان کے اندرون کی دنیا کو بھی نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ اور کرداروں کے فطری جذبات اور احساسات کا تجزیاتی نقشہ اتارا ہے۔

"تلاش"

"چشم زدن کی بات" (انور عظیم۔اپریل ۱۹۶۳ء)

اس مضمون میں انتظار حسین کے مضمون "ہمارے عہد کا ادب" مشتملہ "سویرا" پر

جارحانہ تنقید کرتے ہوئے ان کی ذہنیت پر چیں بہ جبیں ہیں کہ ہجرت پاکستانی ادب کو ایک سمت دینے والا المیہ ہے۔ وہ چودہ اگست سے اپنے ادب کی تہذیبی تاریخ کا آغاز کرتے ہیں۔ انور عظیم ان سے پوچھتے ہیں کیا ان کے ادب سے گنگا جمنا کے پانی کا بہاؤ منجمد ہو گیا ہے کیا ان کی شاعری سے صبح بنارس اور شام اودھ کا حسن مفقود ہو گیا اور الٹی گنگا بہنے والا محاورہ خارج کردیا گیا؟ بولے باتوں سے پھول جھڑتے ہیں، یہ پھول کہاں سے آئے اور ان پھولوں کی خوشبو کہاں کی ہے؟

"نیا ادب پرانی کسوٹی" (راہی معصوم رضا خاص نمبر ۱۹۶۳ء)

اس مضمون میں ترقی پسند ناقدوں کو ہدف تنقید بناتے ہوئے راہی معصوم رضا نے لکھا ہے کہ ہمارے ناقدین نے ہمیشہ اپنے ادب کو پرکھنے کے لیے ادھار کے اصول و نظریات سے کام چلایا۔ اور ۱۹۳۶ء کے بعد کوئی نیا قرض نہیں لیا ہے اسی سے کام چلا رہے ہیں۔ اس طنزیہ جملے کے بعد ان کا اصرار ہے کہ نئے ادب کے لیے نئے اصول تنقید وضع کیے جانے چاہئیں۔ آج کی تنقید کو سنائے کا مزاج داں ہونا پڑے گا جو کہ آج کے ادب کا خاصہ ہے۔ اسے آج کے اسلوب بیان کی روشنی میں جمالیاتی تنقید کے اصول بنانے ہوں گے ورنہ وہ جدید ادب کی تعین قدر نہیں کر سکیں گے۔

"لسانی حرمتیں اور مقدمات" (افتخار جالب۔ خاص نمبر ۱۹۶۳ء)

زبان کے روایتی رابطوں کو توڑ کر تشکیل جدید پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کی پیچیدہ زندگی اور حیات و کائنات کے وسیع مطالعے سے پیدا شدہ حسیّت کو حیطۂ اظہار میں لانے کے لیے زبان کا روایتی ڈھانچہ قطعی طور پر ناکافی ہے۔ اس لیے لسانی حرمتوں کی بات کرنا بے سود ہے اور نئی زبان کی تشکیل ضروری ہے۔ اس کے لیے روایات سے انحراف بھی کرنا ہوگا جس کے نتیجے میں تھوڑا بہت انتشار بھی پیدا ہوگا اور اس انتشار کو برداشت کرنا بھی ضروری ہے۔ اس سے تعمیر کے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔

"محور"

"آتش کی غزل" (وزیر آغا، دسمبر ۱۹۶۶ء)

وزیر آغا اس مضمون میں آتش کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ان کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آتش کی شاعری دہلی اور لکھنؤ کی اسکولوں کا خوبصورت

امتزاج ہے۔ ان کا شعری سفر اندر سے باہر کی طرف ہوتا ہے۔

"دو نقطے اور ایک صفر" (محمود ہاشمی۔ دسمبر ۱۹۶۶ء)

اس شمارے میں محمود ہاشمی کا "دو نقطہ اور ایک صفر شائع ہوا ہے جس کا موضوع علی جواد زیدی کا مضمون " ۱۹۶۴ء کا علاقائی ادب" مشمولہ "انڈین لٹریچر شمارہ ۱۹۶۵۲ء ہے۔ اس مضمون میں زیدی صاحب کی تحقیق کی پول اس طرح کھولی گئی ہے کہ وہ بالکل برہنہ نظر آنے لگتے ہیں۔ غلط اور نامکمل معلومات کی بناء پر اور قرابت اور دوست داری کے جذبات سے مملو ہو کر لکھا گیا ان کا تحقیقی مضمون انتہائی مضحکہ خیز ہے۔

"نظیر اکبر آبادی ایک نیا نقطہ نظر" (مجتبیٰ حسین۔ دسمبر ۱۹۶۶ء)

اس مضمون میں نظیر کی شاعری کے اس پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے نظیر ایک ایسے سنیاسی نظر آتے ہیں جس نے دنیا کو برتتے ہوئے اپنا سنیاس برقرار رکھا ہے۔ "نظیر نے اپنی شاعری میں اپنی عزیز دنیا کو ایک ایسے سنیاسی کی نظر سے دیکھا ہے جو دنیا سے مایوس نہیں ہے بلکہ خوش اور مطمئن ہے اور اسی خوشی اور اطمینان نے اسے پاک دل بنا دیا ہے۔ اردو شاعری کو یہ مخصوص بصیرت نظیر کے علاوہ اور کسی نے نہیں دی۔ ص ۳۲

"سطور"

"آئیڈیالوجی کی بحث" وارث علوی

اس مضمون میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا ہے کہ فی زمانہ آئیڈیالوجی کی بحث کو تنقید سے خارج کر دیا گیا ہے۔ مصنف کا اعتراف ہے کہ شاعر خود نظریہ ساز نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے اطراف میں پھیلے افکار و تصورات سے متاثر ضرور ہوتا ہے اور اس لیے تنقید سے آئیڈیولوجی کو ختم نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس بحث کو ایک نیا موڑ دینے کی ضرورت ہے۔

شمارہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں متعدد تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جن میں گوپال متّل اور اعجاز فاروقی کا مشترکہ مضمون "نئی شاعری میں ابلاغ کا مسئلہ" اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں جدید شاعری پر عائد الزام مہمل گوئی اور ابہام کا جواب دیتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید شاعری مفروضوں کی شاعری نہیں جیسا کہ اس سے قبل کی شاعری ہوا کرتی تھی۔ شعرا اساتذہ کے مضامین کو نئے رنگ سے باندھنے کی مشق کرتے تھے لیکن ان کے مفروضات شاعری طے شدہ تھے۔ ترقی پسند شاعری میں اتنا ضرور ہوا کہ یہ مفروضات

بدلے گئے لیکن یہ بدلے ہوئے مفروضات بہر حال طے شدہ تھے۔ جو لوگ جدید شاعری میں تنہائی، مشینی دور کا کرب، تہذیبی شکست و ریخت، فرد کی بے بسی، بے قدری جیسی خصوصیات گنواتے ہیں وہ گویا نئے قسم کے مفروضات وضع کرتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ نیا شاعر اپنے دل کی غواصی کرتا ہے اور جو کچھ ہاتھ آتا یا نہیں آتا ہے۔ بغیر کسی شرمندگی کے اس کا اظہار کر دیتا ہے۔ اب اگر قاری و فنکار میں ذہنی و جذباتی ہم آہنگی ہے تو ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں۔ بصورت دیگر ابہام تو پیدا ہو گا ہی۔ اور یہ جذباتی ہم آہنگی شاذ و نادر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ چوں کہ جدید شاعر کسی اجتماعی احساس یا مخصوص انداز فکر کا حامل نہیں ہوتا

شمارہ ۱۴، ۱۹۷۱ء میں کئی اہم تنقیدی مضامین سامنے آئے۔ جن میں نظریاتی بحثیں بھی ہیں۔ تنقید پر تنقید اور مجموعی اردو شاعری پر عملی تنقید بھی ہے۔

شمیم نوید کا مضمون "کچھ کوڑھ مکھی اور جوں کے بارے میں" عصری اردو ناقدین پر جارحانہ تنقید ہے۔ جس میں ناقدوں کے لیے ضروری بتایا گیا ہے کہ وہ تمام علوم کا پورا ادراک رکھتا ہو اور ادب کے اسالیب و اصول سے آگاہ ہو۔ اپنی انفرادی پسند کو تنقید کا معیار نہ بنائے۔ قدروں کا صحیح اور واضح تصور اس کے پاس ہو۔ فن کارانہ تجربات میں امتیاز کر سکے اور ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ لیکن مصنف ہمعصر ناقدین میں یہ اوصاف نہیں پاتا اس لیے ان سے نالاں ہے۔ ازیں سبب وہ ان سب کی جم کر کھنچائی کرتا ہے۔

دوسرا مضمون اعجاز فاروقی کا "عصر حاضر کے تقاضے" ہے۔ اس میں صاحب مضمون نے اس بات پر زور دیا ہے کہ فن کار کو اپنا رشتہ سماج سے توڑنا نہیں چاہئے کیونکہ کہ انسان بغیر سماج کے محض حیوان ہے۔ یہ کہنا کہ عصر حاضر کا تقاضہ فرد کی آزادی ہے چھوٹ ہے۔ سماج انسان کی زندگی کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اسے ارتقاء کا موقع دیتا ہے۔ لہٰذا ایسی کوئی آزادی جو سماج کی صحت مند قدروں سے انحراف پر مبنی ہو، غلط ہے۔ فن کار ہو یا سائنس داں، اسے اپنے علم اور فن کو سماجی رشتوں سے مربوط کرنا چاہئے۔

اسی شمارے میں تیسرا مضمون کرامت علی کرامت کا ہے جس کا عنوان ہے "جدید شعری رویہ" یہ مضمون خاصا طویل اور فکر انگیز ہے۔ جس میں مغرب کے وجودی فلسفیوں کے حوالے سے وجودیت کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہمارے اردو شاعروں نے وجودیت سے صرف انفرادی آزادی، تشکک، خوف زدگی اور تنہائی کا المیہ جیسی خصوصیات تو

اخذ کی ہیں لیکن ان المیوں سے نکلنے کی جس انفرادی استعداد کی بات کرتے ہوئے وجودی فلسفے نے ترغیب دی ہے اس کو چھوڑ جاتے ہیں۔ مصنف کا مشورہ ہے کہ نئے شاعر کو حیات و کائنات سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا چاہئے۔ ارتقاء انسانی کے امکانات پر غور و فکر کا در باز رکھنا چاہئے۔ نیز اپنی ذات کو جو مسائل اس دور میں لاحق ہیں ان کو سلجھانے کی مقدور بھر انفرادی کوشش کرنا چاہئے۔ کہ انفرادی کوششیں یکجا ہو کر بہت بڑی اجتماعی طاقت بنتی ہیں۔ اسی مضمون میں مصنف اپنی کلاسیکل روایات سے استفادہ کرکے انہیں بین الاقوامی سطح پر عام کرنے کا ہمیں مشورہ دیتا ہے۔

وارث کرمانی نے اپنے مضمون "جدید اردو غزل میں" جدید کی تعریف بیان کرتے ہوئے جدیدیت سے متعلق شکوک و شبہات رفع کرنے کی کوشش کی ہے اور جدید غزل کے اوصاف بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان مضامین کے علاوہ کچھ اور تنقیدی نگارشات جو "سطور" کے مختلف شماروں میں شائع ہوتی ہیں اہم ہیں۔ مثلاً گوپی چند نارنگ کا مضمون "اردو ادیب مسائل کی دھند میں" مہدی جعفر کا "شاعر' افسانہ نگار (ستمبر ۱۹۷۹ء) وغیرہ ------ اس طرح "سطور" نے جدید تنقید کے فروغ میں اپنے مضامین کے ذریعے اہم رول ادا کیا ہے۔

"معیار"

عتیق اللہ اپنے مضمون "آٹھویں دہائی کی اردو نظم کا کردار" میں ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی تنقیص کے بعد موجود شعری رویے کے مدح خواں نظر آتے ہیں کیوں کہ نئے قلمکاروں کے یہاں جنہوں نے ۱۹۷۰ء کے اردگرد اپنا تعارف کرایا ہے کئی اعتبار سے مختلف اور امکانات سے معمور ہے۔ اس دستے میں سماجی آگہی اور سیاسی شعور ہے۔ اس نوجوان دستے نے ایسی روایت کی بنیاد مضبوط کی جس میں فکر اور اظہار کی آزادی پر اصرار تھا۔ صاحب مضمون نے اپنے دعوے کے ثبوت میں نئے شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

اپریل ۱۹۸۰ء کے شمارے میں قمر احسن اپنے مضمون "نیا اردو افسانہ چند مسائل" میں لکھتے ہیں کہ "کفن" (پریم چند) اور "پھندنے" (منٹو) کی روایت سے ہمارے افسانہ نگاروں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور نئے تجربات پر اصرار کیا۔ ان تجربات کے نتیجے میں اردو افسانے

سے قاری کی دوری بڑھتی گئی۔ نئے افسانہ نگار نے ماضی کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے لیے اسلوب بیان اور ہیئت و موضوعات چنے اور کہانی کو اس کا کہانی پن واپس دیا۔ افسانے کے گرتے ہوئے وقار کا سبب بتاتے ہوئے قمراحسن نے اپنے اس مضمون میں پریم چند پر بھی چوٹ کی ہے۔ ''اردو افسانے کو سب سے زیادہ نقصان پریم چند جی نے پہنچایا تھا وہ تو خدا بھلا کرے منٹو کا کہ اس نے اس کیچڑ میں کنول کا پھول کھلانے کی کوشش کی ورنہ منشی جی نے اردو افسانے کی تمام روایت کو اپنی آئیڈیولوجی اور سماجی روشن خیالی کی نذر کردیا تھا۔'' مصنف ہندوستانی لوک کتھاؤں کو افسانے کی بنیاد بتاتا ہے۔ اس میں مجرد سماجی شعور، تصادم خیروشر، شدید معصومیت و شعریت اور فطرت کی ترجمانی مترشح ہے۔

''شعور''

شمارہ ۱ فروری ۱۹۷۸ء : اس شمارے میں میراجی پر اعجاز احمد کا ایک مضمون ''میراجی۔ شخصیت اور فن'' اور دوسرا وارث علوی کا ''بابو گوپی ناتھ'' اہمیت کا حامل ہے۔ اعجاز احمد کے مضمون میں میراجی کی تحلیل نفسی کے ذریعے ان کی شخصیت کے پراسرار گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے اور ان کی شاعری کے وسیلے سے ان کے مزاج اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وارث علوی نے اپنے مضمون میں منٹو کے افسانے ''بابو گوپی ناتھ'' کا تجزیہ کرکے اس کے فن افسانہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ منٹو کو کردار و واقعہ نگاری پر جو کمال حاصل تھا وہ بے مثال ہے۔ اس کا اسلوب نگارش بھی اگلے پچھلے تمام افسانہ نگاروں سے دلچسپ اور ممتاز ہے۔

دسمبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں انور سجاد کے ناول ''خوشیوں کا باب'' جو کہ اس شمارے میں شائع ہوا ہے، پر فلسفیانہ موشگافیوں کے ساتھ تحسین آمیز تنقید کی گئی ہے۔ اس مضمون کے مصنف شمیم حنفی ہیں۔

شمارہ ۴ میں بھی عملی تنقید کے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً وارث علوی کا مضمون ''سوگندھی'' ص ۳۱ اور عتیق اللہ کا ''مادھو'' شامل ہیں۔ دونوں منٹو کے افسانوں کے مشہور کردار ہیں۔ ان کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کے ذریعے ان حضرات نے منٹو کے فن کے ندرت و عظمت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

”ذہن جدید“

شمارہ ستمبر تا نومبر ۱۹۹۰ء : ذہن جدید میں سنجیدہ ادبی شخصیتوں کی تنقیدی نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس شمارے میں باقر مہدی کا مضمون جو کہ ان کی کتاب ”تنقید کشمکش حصہ دوم“ سے ماخوذ ہے، شائع ہوا ہے جس میں مارکسی جمالیات کا جائزہ لے کر اسے ہدف تنقید بنایا ہے۔ اور ساتھ ہی جدیدیوں کے بدلتے ہوئے طرز عمل پر بھی سخت نکتہ چینی کی ہے۔

شمارہ ستمبر تا نومبر ۱۹۹۲ء میں جمیل جالبی نے اپنے مضمون ”ساختیات کے مباحث تنقید کے ڈھکوسلے ہیں“ میں ان ناقدوں کو ہدف علامت بنایا ہے. جو ذہنی طور پر مغرب کے غلام اور اس کے اندھے مقلد ہیں اور مغرب خصوصاً امریکی جامعات کے برآمد کردہ تنقیدی نظریات کو بغیر اپنی تہذیبی و ادبی روایات سے ان کے ربط پر غور کیے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتے ہیں خواہ ان کی ہمارے یہاں افادیت ہو یا نہ ہو۔ ساختیات، پس ساختیات اور رد تعمیر کے نظریات سماجی معاملہ ہیں۔ مصنف کے بقول ان نظریات کی ہماری تہذیب اور ادب میں کچھ بھی معنویت نہیں۔

جون تا اگست ۹۳ء کے شمارے میں سلسلہ بحث میں آصف فرخی کی رائے پیش کی گئی ہے۔ آصف فرخی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ادیب کی سوانح کو اس کی تحریروں کی تفہیم پر منطبق کرنا گمراہ کن تنقیدی رویہ ہے۔

اس بحث کے علاوہ شموئیل احمد کا مضمون ”منٹو اور بیدی کے افسانوں کی عورتیں“ بھی عملی تنقید کا اچھا نمونہ ہے جو کہ اس شمارے میں شامل ہے۔

دسمبر ۹۲ء تا فروری ۹۳ء کے شمارے میں دو تجزیاتی مضامین شامل ہیں۔ ایک وارث علوی کا ”چھوکری کی موت“ دوسرا شمیم احمد کا ”علی پور کا ایلی“ اول الذکر میں بیدی کے افسانے ”چھوکری کی موت“ کا نفسیات اور فلسفے کی مدد سے کامیاب تجزیہ کیا گیا ہے اور اس افسانے کی ایک ایک خوبی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر الذکر میں ممتاز مفتی کے ناول ”علی پور کے ایلی“ کا تجزیہ کر کے اس کے عیوب و محاسن کو بلا کم و کاست بیان کر دیا گیا ہے۔ اور اس فیصلے پر قارئین کو پہنچایا ہے کہ یہ ناول دلچسپ تو ہے لیکن فنی خامیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔

مارچ- مئی ۹۴ء کے شمارے میں ناصر بغدادی کا مضمون "تجریدی افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ" خاصہ اہم ہے۔ جس میں تجریدی افسانے کی خامیاں بیان کرتے ہوئے ان کو ناقابل فہم بتایا ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ تجریدی افسانے لکھنے والے وہ ادیب ہیں جو اگر رسمی افسانے لکھتے تو بیسویں صدی میں بھی بمشکل جگہ پاتے۔ یعنی تجریدیت کے فروغ میں ناپختہ کار ادیبوں کا رول ہے۔ اور چوں کہ تجریدی افسانے ناقابل ابلاغ ہوتے ہیں لہذا قاری نے ان کو رد کردیا۔ اسی لیے ماجرے والی کہانی کو واپس آنا پڑا۔

"کتاب نما"

اس رسالے کے ہر شمارے میں تحقیقی یا تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مارچ ۱۹۸۸ء کے شمارے میں کمال احمد صدیقی کا مضمون "غالب کی ایک تحریر جو خود انہوں نے بقلم غیر بتائی" شائع ہوا۔ اس مضمون میں مصنف نے یکم فروری کے "ہماری زبان" میں شائع عابد پشاوری کے مراسلے کا جواب نہایت تفصیل سے دیا ہے۔ عابد پشاوری کا قول تھا کہ "اگر تھوڑی دیر کو یہ تسلیم کرلیا جائے کہ زیر بحث خط غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے تو لغزش قلم کے امکان کو یکسر نظر انداز کردینا مناسب نہیں۔ غالب کی تحریر میں لغزشہائے قلم کی مثالیں نادر نہیں۔"

عابد پشاوری نے اپنے خیالات کا اظہار غالب کی تحریروں میں نقطوں اور دائروں کے سلسلے میں کیا ہے۔ جس کا جواب صدیقی نے نہایت مدلل انداز میں دیا ہے۔

جون ۱۹۸۸ء میں عنوان چشتی نے "بشیر بدر کی آمد : ادھ کچری شاعری کی عبرت ناک مثال" میں بشیر بدر کی شاعری میں ایطاء اجتماع ردیفین، شکست ناروا، اور شتر گربہ وغیرہ کے عیوب تلاش کیے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بیشتر الزامات ناقد کی جہالت کا بیّن ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اسی شمارے میں شیخ سلیم احمد کا مضمون "جدیدیت کی سیر" شائع ہوا جس میں مضمون نگار نے حیات اللہ انصاری کی کتاب "جدیدیت کی سیر" پر اظہار خیال کیا ہے اور جدیدیتی افسانوں کے ابہام و اہمال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ان افسانوں کی تشریح خود جدید ناقد یا مثلاً گوپی چند نارنگ وغیرہ بھی نہیں کرپائے ہیں۔ شیخ سلیم احمد نے حیات اللہ انصاری کے تنقیدی شعور کا تجزیہ ان کی اسی کتاب کی روشنی میں کیا ہے اور تعریفی کلمات سے انہیں

نوازا ہے۔

جولائی ۱۹۸۸ء کے شمارے میں عبدالمغنی کا مضمون "عروج اقبال" شائع ہوا ہے۔ جس میں موصوف نے افتخار احمد صدیقی کی کتاب "عروج اقبال" کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور بیشتر خامیوں کی نشان دہی کی ہے۔

اگست ۱۹۸۸ء کے شمارے میں ابوالکلام قاسمی کا مضمون "نئی شاعری کے امکانات" بڑا عالمانہ مضمون ہے اور مصنف کی وقت نظری کا پتہ دیتا ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے حیدر نقوی کے مجموعہ کلام "شب آہنگ" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اسی شمارے میں شمیم حنفی نے اپنے مضمون "بیدی کا کردار" میں بیدی کی کردار نگاری پر تجزیاتی انداز میں تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بیدی اپنے کرداروں کی تخلیق و تعمیر میں مبالغہ آمیز جذبات، غیر معمولی واقعات اور کرداروں سے دماغ کی چولیں ہلا دینے والی فلسفیانہ موشگافیوں سے، تاریخ اور تہذیب کے مرعوب کن حوالوں سے، فیشن ایبل آدرشوں اور مقاصد سے اپنا دامن ہمیشہ بچاتے رہے۔

ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں ابراہیم یوسف کا مضمون "ابتدائی منظوم ڈرامے اور تنقید" شائع ہوا ہے۔ جس میں اردو کے ابتدائی منظوم ڈراموں پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس دور کے ڈرامے بہت اچھے تھے مگر ناقدین نے جان بوجھ کر ان کو اہمیت نہیں دی۔ اس کے علاوہ مضمون نگار نے ابتدائی اردو ڈراموں پر عوامی اسٹیج کے اثرات کے علاوہ مثنوی کے نمایاں اثرات کی بھی نشان دہی کی ہے جب کہ دیگر ناقدین نے اس پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔

دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں یعقوب عجم کا مضمون "مخدوم محی الدین اور اقدار کی شکست و ریخت" شائع ہوا ہے۔ جس میں مختلف ادیبوں کے خیالات کی مدد سے مخدوم کی سوانح حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

فروری ۱۹۸۹ء میں مظہر امام کا مضمون "ترقی پسند ادبی تحریک۔ بے سمت سفر" ایک عمدہ ناقدانہ مضمون ہے۔ جو کہ انہوں نے ۳ر اگست ۵۲ء میں لکھا تھا۔ اور جو انہیں پرانے کاغذات میں ملا۔ اس مضمون میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کا مکمل جائزہ لیا ہے اور تحریک کے علم برداروں مثلاً سردار جعفری، کرشن چند، عروج نیاز حیدر وغیرہ کی خوب خبر لی ہے۔

ان مضامین کے علاوہ چند اور اہم مضامین کے عنوانات ذیل میں ہیں :

انیس کی شاعرانہ عظمت	باقر مہدی	جنوری ۱۹۸۲ء
مخدوم شعور شخصیت	اقبال متین	"۱۹۸۹ء
احمد جمال پاشا	قاضی عبد الغفار	جنوری ۱۹۸۹ء
ایضاً	پطرس بخاری	ایضاً
گردش رنگ چمن	عبد المغنی	مارچ "
نئی اصطلاحیں	شمس الرحمٰن فاروقی	جون ۱۹۹۰ء
قرۃ العین حیدر	صدیق الرحمٰن قدوائی	اگست ۱۹۹۰ء

"ایوان اردو"

"غالب اور ڈرامہ" ابراہیم یوسف کا یہ مضمون مارچ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ جس میں غالب کے حالات زندگی اور شخصیت کو بنیادی حوالے کے طور پر استعمال کر کے غالب پر لکھے گئے ڈراموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

دسمبر ۱۹۸۸ء (آزاد نمبر) میں ابو سلمان شاہجہاں پوری کے مضمون "مولانا آزاد اور مرزا غالب" میں مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" میں جو مولانا آزاد نے غالب سے متعلق بہت سے اہم حقائق کی نشان دہی کی ہے۔ یہاں ان کے علاوہ عبد الرزاق ملیح آبادی کی مرتب کردہ تصنیف "ابوالکلام آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" کے حوالوں سے آزاد کی غالب سے متعلق معلومات اور عمیق مطالعے کی وضاحت کی گئی ہے۔

"اردو میں کبت' (رشید حسن خاں۔ جون ۱۹۷۸ء) میں ہندی کی صنف سخن کبت سے بحث کرتے ہوئے اردو کی بعض اہم تصانیف میں ان کی مثالیں تراش کر اردو میں کبت کی تاریخ سے متعلق جامع اور پہلا مضمون ہے۔

"اردو کی تذکیر و تانیث پر پشتو کا اثر" (مولانا امتیاز علی خاں عرشی' مارچ ۱۹۹۰ء) میں اردو اور پشتو کے قاعدہ تذکیر و تانیث پر سیر حاصل بحث کے ساتھ پشتو زبان کے تذکیر تانیث سے تعلق کی وضاحت درج ہے۔

"افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش" (شمس الرحمٰن فاروقی' اگست ۱۹۸۷ء) میں مصنف نے اپنے خاص انداز میں نہ صرف بیانیہ سے متعلق اپنے خیالات کی تنقیدی وضاحت

کی ہے بلکہ معاصر نقادوں کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔

سید فضل امام نے اپنے مضمون "عہد حاضر میں میرزا دبیر پر تحقیقی و تنقیدی کام" (اگست ۱۹۹۱ء) میں میرزا دبیر کی شاعرانہ عظمت سے متعلق تحقیق و تنقیدی سرمائے کا فکرانگیز تجزیہ پیش کیا ہے۔

"اقبال کی نظم سوامی رام تیرتھ (گیان چند جین، نومبر ۱۹۸۷ء) پنجاب کے مشہور سناتن دھرم سنت سوامی رام تیرتھ کی وفات پر لکھی گئی اقبال کی نظم کی تشریح بمع رام تیرتھ کی داستان حیات شامل ہے۔

حکم چند نیر نے اپنے مضمون "منشی پریم چند سے منسوب بعض تحریروں کے بارے میں" (ستمبر ۹۱ء) میں پریم چند سے منسوب بعض تحریروں کی جانب انگشت نمائی کر کے تحقیق کے لیے مزید راہ ہموار کی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ ذیل کی نگارشات بھی خصوصی طور پر اہم ہیں۔

غالب کی ایک غزل	جگن ناتھ آزاد	جون ۱۹۸۸ء
اندر جیت لال کی نگارشات	جاوید وششٹ	جون ۱۹۹۱ء
قمر مراد آبادی کی شاعری	حبیب الرحمٰن نیازی	ستمبر ۱۹۹۰ء
رباعی اور زحاف عروض	زار علامی اوپی اگروال	جنوری ۱۹۹۱ء
اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ مہ لقابائی چندا	ابوالفیض سحر	جنوری "
اردو کے محاورے اور کہاوتیں	ضمیر حسن دہلوی	جولائی ۱۹۸۹ء
ہماری شاعری اور ہندوستانی تہوار	عبدالباری	ستمبر ۱۹۹۰ء
خواجہ احمد عباسی	محمد حسن	دسمبر ۱۹۸۷ء
اردو میں دوہے	مظفر حنفی	اگست "
نصف صدی پہلے کا ایک نایاب ادبی جریدہ	مظہر امام	اپریل ۱۹۹۰ء

متذکرہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید کے تعلق سے جو ترقی ہمارے ادب میں ہوئی اس کی نمائندگی ان رسائل نے مناسب طور پر کی ہے اور ہر مکتبہ فکر کے ادیبوں، ناقدوں اور محققین کو اپنی بات کہنے کا موقع دیا ہے۔ البتہ بعض ترقی پسند اور جدیدیتی

رسالوں میں یہ رویہ ملتا ہے کہ ان میں مخصوص طرز فکر کے حامل قلمکاروں ہی کی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں۔ لیکن زمانۂ اعتدال میں یہ تخصیص ختم ہوجاتی ہے اور تنگیٔ ذہن وسعتِ قلب میں بدل جاتی ہے لہٰذا کٹر قسم کی ترقی پسندی میں جدیدیت اور کٹر قسم کی جدیت میں ترقی پسندی دھڑلے سے آمیز ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ فی زمانہ جو رسائل شائع ہو رہے ہیں ان میں ماضی کی عصبیت بہت حد تک دور ہو گئی ہے۔ جو ناقدین خود کو ترقی پسند کہتے تھے ان کے یہاں ادب کی جمالیاتی قدروں پر زور دینے کا رجحان ملتا ہے اور اسی طرح وہ قلم کار جو انفرادی آزادی کے مدح خواں تھے اور ادب کی سماجی ذمہ داری سے انکار کرتے تھے' بہانگ دہل اس بات کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ فن کار اپنے عہد اور سماج سے چشم پوشی اختیار نہیں کرسکتا۔ وہ جس دنیا میں رہتا ہے وہاں کے خارجی متعلقات اس پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہت سے مصائب و آلام اور مسائل اس کو اپنی زد میں لیے رہتے ہیں۔ داخلی کیفیات اپنے خارجی عوامل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء کے بعد جو گروہ تنقید کے میدان میں اترا ہے وہ تو بے چارہ سرے سے نہ پہلے کسی نظریے کو مانتا تھا نہ اب کسی کو مانتا ہے۔ بس فن پارے کو پڑھا اور اپنی رائے کچھ اساتذہ کے اقوال کی مدد سے پیش کردی۔ ان میں صرف چند لوگ ایسے ہیں جو کسی مخصوص نظریے کے تحت اپنے تنقیدی اصول وضع کرتے ہیں۔ آج رسائل ان تمام قسم کے ناقدوں کو برابر موقع فراہم کررہے ہیں بعض رسائل کو چھوڑ کر جو صرف شعری و افسانوی اصناف ہی شائع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں بقیہ تمام ادبی رسائل میں سنجیدہ ادبی مباحث کی روایت جاری ہے۔ ادھر کچھ نئے تنقیدی نظریات امریکی دبستان کی طرف سے جو ہمارے یہاں در آمد کیے گئے ہیں' ان پر بھی ''کتاب نما'' وغیرہ میں مضامین مسلسل شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً ساختیات' پس ساختیات اور رد تعمیر وغیرہ۔ ہمارے ناقدین میں مغرب سے استفادے کا جو رجحان چل رہا ہے اس کا پتہ بھی ان رسائل سے ملتا ہے۔ لیکن بعض قابل ناقدین ادب اب اردو ادب کو مشرقی اصول تنقید کی روشنی میں پرکھنے پر زور دے رہے ہیں۔ جس کی نشان دہی دہلی کے ان رسائل سے ہوتی ہے۔

ان مطالعات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو تحقیق و تنقید کی سمت و رفتار کو متعین کرنے اور ان کی اشاعت کے لیے دہلی سے جاری ہونے والے اردو کے ادبی رسائل کسی قدر سنجیدگی سے کام کررہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ماحصل

دہلی کو جہاں سیاسی و تجارتی اعتبار سے مرکزیت حاصل رہی ہے وہیں تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے بھی یہ شہر نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مختلف مذہبوں کے ماننے والوں اور علاقائی و نسلی گروہوں کی آمد کا سلسلہ زمانہ قدیم سے یہاں جاری ہے۔ جس کے باعث یہاں ایک مشترکہ ثقافت کو فروغ ملا۔ اسی مشترکہ ثقافت کا ایک نمایاں مظہر ہے اردو زبان۔ زبان اردو کی ابتدا اور ارتقا میں اس شہر کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے۔ شاہان مغلیہ درباروں شعراء اردو کی جو حوصلہ افزائی ہوتی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ دہلی کے گلی کوچے اردو شعرو سخن کی انجمن نظر آتے تھے اور وہ ادبی ماحول جو خان آرزو۔ مرزا مظہر جان جاناں، شاہ مبارک، مضمون، یقین، میر، درد، سودا، ذوق، غالب، مومن، داغ اور ظفر جیسے شعراء کی کاوشوں سے یہاں پیدا ہوا تھا۔ اس کو برقرار رکھنے میں یہاں کے اہل ذوق حضرات نے ہمیشہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اپنی سنجیدہ کوششوں سے چمنستان ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ یہ کوشش ادبی محفلوں، مشاعروں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کے علاوہ اخبارات و رسائل کی شکل میں ہمیشہ سامنے آتی رہی ہیں۔

آزادی سے قبل اردو کو ملک کی دفتری زبان ہونے کا فخر حاصل تھا لہٰذا اس کو قبولیت عام کا درجہ حاصل تھا۔ لیکن آزادی کے بعد اس کو مسلمانوں کی زبان بنا کر پیش کیا گیا۔ ہر چند کہ عوام کے استعمال میں یہ زبان آج بھی اسی طرح ہے جس طرح آزادی سے قبل تھی۔ لیکن یہ سیاست کی ستم ظریفی ہے کہ جو تعصب اردو اور ہندی کے مابین پیدا کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام ذرائع ابلاغ اردو کا استعمال ہندی کہہ کر کر رہے ہیں۔ ان حالات میں جو اردو کو اس کی اصل حیثیت میں قائم رکھنے اور فروغ دینے کا کام کر رہے ہیں ان کا تمام محبان اردو ممنون احسان ہیں۔

اردو کو فروغ دینے والے ان ذرائع ابلاغ میں رسائل کا رول انتہائی اہم ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو دہلی کے دیگر موضوعات کی طرح یہاں کے ادبی رسائل پر بھی کام کیا جانا چاہئے تھا لیکن نہ جانے کیوں اس طرف کسی کی نظر التفات نے زحمت نہ کی اور آزادی کے بعد دہلی میں جو ادبی رسائل شائع ہوئے یا ہو رہے ہیں ان کا تفصیلی تو کیا اجمالی

جائزہ بھی قاعدے سے ابھی تک نہیں لیا گیا۔

راقم السطور کے ذہن میں آزادی کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے اردو کے ادبی رسائل کا جائزہ لینے کا خیال اس لیے پیدا ہوا کہ ان رسائل نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان رسائل کے جائزے سے بہت سی اہم باتیں سامنے آئیں۔ مثلاً کون سا رسالہ کب جاری ہوا؟ ان کے مدیر ان کون کون رہے؟ کس رسالے کی کیا پالیسی تھی؟ کن ادبی تحریکا و رجحانات کو ان کے ذریعے فروغ ملا ہے عصری حالات و واقعات کی جھلکیاں کس حد تک ان میں دکھائی دیتی ہیں؟ ان رسائل میں کس قسم کی شعری و نثری نگارشات شائع ہوتی رہیں؟ تحقیقی مضامین کس نوعیت کے چھپتے رہے وغیرہ۔

ا۔ آزادی سے قبل دہلی میں ادبی صحافت کی بنیادیں کافی مستحکم ہو چکی تھیں۔ "عصمت" "ادیب" "ادبی کائنات" "اردو" "شبستان" ساقی وغیرہ رسائل نے عمدہ صحافتی خدمات انجام دیں۔ آزادی کے بعد ساقی کو اس کے مدیر شاہد دہلوی کراچی لے گئے۔ اس طرح بعض رسائل یا تو بند ہو گئے یا پاکستان ہجرت کر گئے۔ "آج کل" جو کہ حکومت ہند کا ترجمان تھا اور معیاری ثقافتی مضامین و تخلیقات شائع کرتا تھا' آزادی کے بعد نئے جوش وولولے سے نکلنا شروع ہوا۔ آغاز میں ۱۵ روزہ تھا پھر ماہنامہ ہو گیا۔ یہ نئی ابتداء جوش ملیح آبادی کی ادارت میں ہوئی اور ۱۹۵۵ء تک جوش اس کے مدیر رہے۔ ۱۹۳۶ء سے ترقی پسند تحریک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان ادب پر چھائی رہی اور تقسیم کے بعد جب اس تحریک سے وابستہ رسائل اور سربر آوردہ افراد پاکستان چلے گئے تو دہلی سے اس خلا کو پر کرنے اور ادبی محاذ پر ترقی پسند تحریک کو زندہ کرنے کے لیے ۱۹۴۹ء میں "شاہراہ" جاری کیا گیا۔ اس تحریک کی ترجمانی بعد میں "عصری ادب" اور "عصری آگہی" نے کی۔ جن میں آخر الذکر ہنوز جاری ہے۔ ان کے علاوہ "تحریک" ایک بڑا رسالہ تھا جو ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا اور جس کی ادارت گوپال مثل' مخمور سعیدی اور پریم گوپال مثل وغیرہ کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۹۸۰ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ترجمان رسائل میں۔ "محور" "تخلیق" "تلاش" "معیار" "تناظر" "شعور" اور "ذہن جدید" جاری ہوئے۔ مکتبہ جامعہ سے ایک رسالہ "کتاب نما" جاری ہوا۔ یہ رسالہ بھی آج تک جاری ہے۔ "بیسویں صدی" کافی عرصے سے نکل رہا ہے۔ جس کے مدیر پہلے خوشتر گرامی تھے بعد میں اس کو رحمٰن نیر نے خرید لیا اور جب سے ان کی

ادارت میں عوامی دلچسپی کا یہ پرچہ پابندی وقت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ دہلی اردو اکیڈمی کا ماہنامہ ''ایوان اردو'' بھی آج تک پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ''فن کار'' اور ''آئینہ'' بھی کچھ برسوں تک نکلے پھر بند ہو گئے۔ ان رسائل کے علاوہ کچھ ایسے فلمی، مذہبی اور سیاسی رسائل بھی جاری ہوئے جن میں تھوڑا بہت ادب بھی شامل ہوتا ہے۔ خالص تحقیقی و تنقیدی رسائل میں ''غالب نامہ''۔ ''تحریر'' ''اردو ادب'' کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ترقی اردو بیورو کا شش ماہی رسالہ ''فکر و تحقیق'' بھی خالص تحقیقی و تنقیدی رسالہ ہے۔ جو ۱۹۸۹ء میں جاری ہوا اس ذیل میں اردو بیورو کا خبرنامہ ''اردو دنیا'' بھی آتا ہے۔

۲۔ دہلی سے جاری ہونے والے ان رسائل نے آزادی کے بعد اردو ادب کو متاثر کرنے والے رجحانات اور تحریکات کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔ مثلاً ''شاہراہ'' ایک ایسے دور میں جاری ہوا جب ترقی پسند تحریک پر انحطاطی کیفیت طاری تھی۔ اس رسالے نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی سرگرمیوں کو عوام میں متعارف کرانے کا کام کیا۔ اس میں تحریک سے وابستہ قلمکاروں کی پریشانیوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ جیل سے تحریک کے وابستگان جو خطوط بھیجتے تھے ان کو شائع کیا جاتا تھا۔ جلسوں اور کانفرنسوں کی روداد یں چھپتی تھیں، ان کے اعلان نامے شائع ہوتے تھے۔ تنقیدی مضامین کے ذریعے ترقی پسندوں کا احتساب ہوتا تھا اور تخلیقی ادب کی اشاعت کے ذریعے سماجی مسائل کو ابھارا جاتا تھا نیز قلمکاروں کے لیے مارکسی ادب کے نمونے پیش کیے جاتے تھے۔

''عصری ادب'' اور ''عصری آگہی'' میں بھی ایسی نگارشات شائع ہوتی تھیں جن سے ترقی پسند تحریک کا مقصد پورا ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ رسائل ترقی پسند تحریک کو باقی رکھنے میں معاون ثابت ہوئے۔

''تحریک'' نے ترقی پسندی سے انحراف کا دروازہ کھولا اور اس کی مخالفت کے لیے پلیٹ فارم کی حیثیت سے استعمال ہوا۔ اس رسالے نے مارکسی نظام سیاست اور نظریہ ادب کی مخالفت کے ساتھ ساتھ جدید مغربی رجحانات سے قارئین کو متعارف کرایا۔ اس رسالے نے اردو میں اس اسلوب کی داغ بیل ڈالی جو جدیدیت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ میراجی نے جس انداز بیان کو اختیار کر کے انفرادی آزادی کی آواز اٹھائی تھی اور داخلی کیفیات کو ادب میں پھر سے لانے کی کوشش کی تھی۔ ''تحریک'' نے اسے جدیدیت کے رجحان کی شکل میں

عوام تک پہنچایا۔ ان میں "محور" "تخلیق" ۔ "تلاش" "سطور" خاص طور پر اہم ہیں۔

جدیدیت کا زور کم ہوا تو ترقی پسند اور جدیدیت کے نظریات ادب کی آمیزش سے ایک نیا رجحان سامنے آیا جس کو تیسری آواز یا مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اس رجحان کے علمبردار رسائل نے اسے فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان رسائل میں "تناظر" "معیار" "شعور" "ایوان اردو" "کتاب نما" اور "ذہن جدید" اہم ہیں۔

۳۔ دہلی سے جاری ہونے والے ان ادبی رسائل نے ادبی اداریہ نویسی کو فروغ دیا۔ اور عصری حالات سے باخبر کرتے ہوئے ایسے مباحث کو اپنے اداریوں میں جگہ دی جن کی اہمیت اس وقت سمجھی جاتی تھی۔ اپنی اپنی پالیسی کے مطابق ہر رسالے نے ادب کے ہمعصر منظر نامے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ادبی وقعات پر تبصرہ کیا۔ اور اردو سے متعلق مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ "آج کل" اور "بیسویں صدی" کو چھوڑ کر یہ خصوصیت تمام رسائل میں ملتی ہے۔ "کتاب نما" کے اداریے مہمان مدیر سے لکھوائے جاتے ہیں جو کہ مضمون کی مانند طویل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی پسند رسائل ملک کے سیاسی و سماجی حالات پر بھی تبصرہ کرتے ہیں۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے علمبردار رسائل مختصر اداریوں کے حامل ہوتے تھے۔ لیکن ان میں کوئی نہ کوئی کام کی بات اٹھائی جاتی تھی۔ یہ رسالے اپنے اداریوں میں یا تو اپنی پالیسی کا ذکر کرتے تھے یا جدیدیتی اسلوب کی وکالت اور اس میں در آنے والے غیر صحت مند عناصر کا شکوہ۔ "تحریک" نے ہمیشہ اپنے اداریوں میں ترقی پسند تحریک کی تنقیص کی اور ساتھ ہی کمیونسٹ نظام سیاست کی برائی بھی۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی عصری ادبی حالات واقعات پر تبصرہ بھی اس رسالے میں ملتا ہے۔

۴۔ ان رسائل میں جو شعری اصناف شائع ہوئیں ان کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ آزادی کے بعد اردو ادب جن نئی ہیئتوں اور اسالیب سے روشناس ہوا۔ ان کی ترجمانی اور نمائندگی ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ہر دور کے نامور قلم کاروں نے نت نئے تجربات کیے اور اسلوب کی سطح پر کئی اہم اضافے سامنے آئے۔ کلاسیکی اسلوب کے ساتھ نئے علامتی اسالیب کی ترجمانی میں آج کل، تحریک، محور، تخلیق، تلاش، سطور، معیار، تناظر، شعور، ذہن جدید، کتاب نما، اور ایوان اردو، پیش پیش ہیں۔ شاہراہ، عصری ادب، عصری آگہی نے پہلے پہلے عوامی اسالیب کو اختیار کیا پھر کلاسیکیت کی آمیزش سے جدید اسلوب کو فروغ دیا۔

موضوعات کی سطح پر بھی ان رسائل میں شائع ہونے والی تخلیقات میں تنوع ملتا ہے۔ تقسیم کے بعد کے مسائل، ہجرت، اغوا، فسادات، سیاسی و سماجی انتشار جیسے موضوعات ہمیں آج کل، شاہراہ، عصری ادب، عصری آگہی وغیرہ میں زیادہ ملتے ہیں۔ جب کہ انسان کی داخلی کیفیات تنہائی، خوف، تشکک، ماضی پرستی و مذہب پرستی، رشتوں کی شکست و ریخت پر مشتمل موضوعات سطور۔ تخلیق، تلاش، محور، ذہن جدید وغیرہ میں زیادہ برتے گئے۔ تحریک، معیار، تناظر، شعور، کتاب نما، ایوان اردو وغیرہ رسائل میں ہر قسم کے موضوعات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ آخری دور کے رسائل مثلاً ذہن جدید، اور شعور وغیرہ میں کسی نظریاتی قید کا سراغ نہیں ملتا۔ شعور البتہ ایک عجیب مزاج کا حامل رہا ہے۔ اس میں اسلوب کی سطح پر جدیدیت اور موضوع کے اعتبار سے اشتراکیت کا زور زیادہ ہے۔

۵۔ آزادی کے بعد اردو ادب میں جن نثری اصناف کو فروغ ملا ان میں افسانہ، ناول، ڈرامہ، انشائیہ، طنز و مزاح، رپورتاژ، خاکہ، سفرنامہ اہم ہیں۔ دہلی کے ان ادبی رسائل نے اپنے اپنے طور پر ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔ بعض رسائل نے جملہ اصناف نثر کی پذیرائی کی اور بعض نے صرف ناول و افسانے کی اور بعض نے افسانے اور طنز و مزاح کو قابل اعتنا سمجھا۔ آج کل، اور شاہراہ، نے سب سے زیادہ اصناف نثر کو اپنے صفحات پر جگہ دی جب کہ دیگر رسائل میں افسانوں کے علاوہ اصناف بہت کم چھپی ہیں۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ترجمان رسائل میں افسانے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کسی کسی شمارے میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین مل جاتے ہیں۔ اور بس۔ تحریک میں افسانے زیادہ ہیں۔ تھوڑے بہت مزاحیہ مضامین اور انشائیے بھی شائع ہوئے ہیں۔ عصری ادب، اور عصری آگہی، میں ڈرامے بھی چھپے ہیں اور انشائیے بھی۔ لیکن ان رسائل نے بھی سفرناموں اور شکاریات یا رپورتاژ اور خاکوں کو نظر انداز کیا ہے۔ اکا دکا خاکہ البتہ مل جاتے ہیں۔ ایوان اردو، کتاب نما، اور بیسویں صدی، میں زیادہ تر افسانوی نثر پر بھی زور دیا گیا ہے۔ ان رسائل میں جو ترقی پسند ہیں ان میں سماجی حقیقت نگاری کا رجحان غالب ہے اور داخلی زندگی سے زیادہ انسان کی خارجی کائنات اور خارجی مسائل حیات پر توجہ دی گئی ہے۔ ان رسائل کا اسلوب عام فہم ہے۔ جدیدیت کے شباب کے زمانے میں ترقی پسند رسائل نے بھی علامتیت کو اختیار کیا لیکن مجموعی اعتبار سے ترقی پسند رسالوں کا اسلوب قریب الفہم ہی رہا۔ ان رسائل کی بعض نگارشات عوامی لہجے میں بھی

ملتی ہیں۔

شعور' کے افسانے عام طور پر تحریری اور علامتی پیرائے میں لکھے گئے ہیں جدیدیت کے ترجمان باقی رسائل میں بھی تجریدی و علامتی اسلوب ملتا ہے لیکن ان میں اتنی شدت نہیں۔ مثلاً محور' تخلیق' ۔ تلاش۔ میں روایتی بیانیہ اسلوب بھی ملتا ہے۔ معیار۔ تناظر شعور وغیرہ ملے جلے اسلوب کے حامل ہیں۔ ان میں علامتیں اور استعارے زیادہ مشکل الفہم نہیں ہیں اور بعض افسانے تو بہت آسان روایتی اسلوب کے حامل بھی ہیں۔ غیر جانب دار رسائل نے ہر مکتبہ فکر کو موقع دیا اور اسی لیے ان میں متنوع اسالیب کے حامل افسانے چھپتے رہے۔ البتہ بیسویں صدی 'میں تجریدیت سے گریز کیا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی و تنقیدی میدان میں بھی دہلی کے ان رسائل نے آزادی کے بعد اہم خدمات انجام دی ہیں۔ بعض رسائل مثلاً اردو ادب' غالب نامہ' فکر و تحقیق' تحریر' اردوئے معلیٰ' جو کہ خالص تنقیدی و تحقیقی رسائل ہیں کے علاوہ' دیگر رسائل میں بھی اس طرف توجہ کا رجحان ملتا ہے۔ آج کل' میں مشاہیر ادب کے تحقیقی و تنقیدی مضامین مسلسل چھپتے رہے ہیں جن میں مارکسی' تاثراتی' نفسیاتی اور جمالیاتی تنقید کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

کتابیات

اشرفی وہاب	آگہی کا منظر نامہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی	۱۹۸۴ء
انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۸۵ء
انصاری فاروقی	اشاریہ ایوان اردو	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۹۴ء
پروین جہاں	شاہراہ کا توضیحی اشاریہ	مقالہ برائے ایم فل علی گڑھ	۱۹۸۸ء
جمیل اختر	اشاریہ آجکل (جلد اول)	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۸۹ء
چشتی عنوان	آزادی کے بعد دہلی (جلد اول)	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۹۴ء
حنفی مظفر	تنقیدی للبعاد	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۸۷ء
حنفی شمیم	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۷۷ء
خان نادر علی	اردو صحافت کی تاریخ	ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۶۷ء
خاں نصیر احمد	آزادی کے بعد اردو انشائیہ	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۹۴ء
دہلوی انور علی	اردو صحافت	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۸۶ء
راحت سہیل	اردو اداریہ ارتقاء	رنگ محل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۸۷ء
ردولوی شارب	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۹۱ء
سرور آل احمد	ادبی تنقید کے اصول	" " "	"
سرور آل احمد	تنقید کیا ہے	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۸۴ء
شکیل الرحمن	ادبی قدریں اور نفسیات	معصوم پبلیکیشنز پٹنہ	۱۹۵۶ء
شاہد کلیم	تحرک	حق شناس پبلیکیشنز پٹنہ	۱۹۸۶ء
صابری امداد	تاریخ صحافت اردو جلد اول	چوڑی والان دہلی	۱۹۵۳ء
"	" جلد دوم	"	۱۹۷۲ء
"	" جلد سوم	"	۱۹۶۳ء

صابری امداد	جلد چہارم	چوڑی والان، دہلی	۱۹۷۴ء
"	جلد پنجم	"	۱۹۸۳ء
صابری امداد	روح صحافت	مکتبہ شاہراہ دہلی	۱۹۶۸ء
صدیقی عظیم الشان	آزادی کے بعد اردو افسانے کے رجحانات	"	"
"	اظہار خیال	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۹۵ء
صدیقی محمد عتیق	ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۵۷ء
عتیق اللہ	آزادی کے بعد دلی میں اردو نظم	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۹۱ء
علوی تنویر احمد	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۹۲
قمر رئیس	آزادی کے بعد دہلی میں افسانہ	"	۱۹۹۱ء
"	ترقی پسند پچاس سالہ نمبر	"	۱۹۸۷ء
محمد ذاکر	آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۱
محمد حسن	مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات	"	"
نارنگ گوپی چند	قاری، اساس، تنقید مظہریت اور قاری کی واپسی	ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی	۱۹۹۳ء
ندوی سید احتشام احمد	تنقیدی نظریات کا مطالعہ	فیض احمد فیض آندھرا	۱۹۷۱ء
منہاج انور	اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ	نصرت پبلیکیشنز لکھنؤ	۱۹۸۵ء
فرہنگ آصفیہ (اول، دوم، سوم)	سید احمد دہلوی	ترقی اردو بورڈ دہلی	۱۹۹۰ء

رسائل

آجکل	راج نرائن راز	دہلی	۱۹۸۴ء
شب خون	شمس الرحمٰن فاروقی	الہ آباد	۱۹۹۵ء
عصری ادب	محمد حسن	دہلی	۱۹۸۰
جامعہ	شمیم حنفی	دہلی	۱۹۹۵
کتاب نما	شاہد علی خاں	دہلی	۱۹۸۷
چنگاری	بشیر احمد	دہلی	۱۹۷۰
بیسویں صدی	رحمٰن نیرّ	دہلی	۱۹۹۵
فروغِ اردو	ادارۂ فروغ اردو	لکھنؤ	۱۹۷۰
تعمیر ہریانہ	کشمیری لال ذاکر	ہریانہ	۱۹۹۴
تحریک	گوپال متّل	دہلی	۱۹۶۰
شاعر	افتخار امام	ممبئی	۱۹۹۳

ضمیمہ

دہلی سے شائع ہونے والے ادبی و نیم ادبی رسائل کی فہرست
(آزادی سے قبل، آزادی کے بعد)

آزادی سے قبل کے رسائل

خیر خواہ ہند	ماسٹر رام چندر	دہلی کالج دہلی	۱۸۴۷ء
محب ہند	ماسٹر رام چند	دہلی کالج دہلی	۱۸۴۷ء
فوائد الشائقین	پر بھودیال	دہلی کالج دہلی	۱۸۴۹ء
رسالہ دہلی سوسائٹی	پیارے لال آشوب	دہلی	۱۸۶۷ء
ہندوستانی اردو لغات	سید احمد دہلوی	دہلی	۱۸۸۲ء
ریختہ	مہانارائن	حوض قاضی دہلی	۱۸۸۲ء
مشاعرہ	مرزا یعقوب بیگ عامل	دہلی	۱۸۸۳ء
سلام	امیر سنگھ	درگاہ حضرت نظام الدین دہلی	۱۹۸۴ء
جادۂ حق	منوّر علی	چاندنی چوک دہلی	۱۸۸۴ء
قانونی معاہدے کا رسالہ	مہتاب رائے وکیل	چاوڑی بازار دہلی	۱۸۸۴ء
مشیر ہند	امیر سنگھ	دہلی	۱۸۸۴ء
افسانۂ ایام	مولوی نصرت علی قیصر	فراش خانہ دہلی	۱۸۸۵ء
جادو (ماہانہ)	رُکن الدین	بہرام خاں دہلی	۱۸۸۵ء
گلدستہ کلام (ماہنامہ)	امیر سنگھ	دہلی	۱۸۸۶ء
دہلی گائڈ	امیر سنگھ	ایضاً	۱۸۸۶ء

خادم طلباء	الطاف حسین حالی	دہلی	۱۸۸۶ء
زبان (ماہانہ)	مولانا راسخ دہلوی	مطبع مظہر العجائب	۱۸۹۳ء
نسیم (ماہانہ)	محمد عبدالستار	ٹمیا محل دہلی	۱۹۰۰ء
نظام المشائخ	خواجہ حسن نظامی	بستی حضرت نظام الدین	۱۹۰۹ء
منادی (ہفتہ وار)	بھیا احسان الحق		
	خواجہ حسن نظامی	دہلی	۱۹۲۲ء
دین دنیا	شوکت علی فہمی	”	۱۹۲۰ء
درویش	عبدالرشید غزنی		۱۹۲۰ء
پیشوا	عزیز حسن بقائی		۱۹۲۵ء
حریت	عزیز حسن بقائی و رئیس حسن بقائی		
عادل (ہفتہ وار)			۱۹۳۰ء
روزنامچہ (ادبی)	خواجہ حسن نظامی		۱۹۳۲ء
اردو	مولوی عبدالحق	”	”
رئیس ہند	منشی بھگونت رائے	”	”
صدائے عام	میر ناصر دہلوی	”	”
طبیب	محمد الواحدی		”
کمال دہلی	پیارے لال رونق	”	”
مجلہ طبیہ کالج	حکیم عبدالرزاق	”	”
ترنگ	عزت الرحمٰن رامپوری		
الہادی	محمد عثمان		
ہفوات الصالحین	میرزا سلطان گورگانی		
نقوش	محمد طفیل		
طلوع اسلام	محمد ظہیرالدین صدیقی		
علوم القرآن	ڈاکٹر اشتیاق احمد		

شبستان	یونس دہلوی
طاقت	شوکت تھانوی
رعیت	نیاز فتح پوری
گروسیوک	محمد بن فساء نظامی
اسکول گزٹ	خواجہ بانو
کائنات	عقیل
روپیہ	عبد الخالق
کامیابی	ڈاکٹر پسند احمد بریلوی
کامیاب	سید ظفر نیازی
ساقی	شاہد احمد دہلوی
ادیب	فصیح دہلوی
عصمت	راشد الخیری

آزادی کے بعد کے رسائل

رسالہ	مدیر	پتہ	سنہ
بیسویں صدی (ماہانہ ٔ ادبی)	خوشتر گرامی	انصاری روڈ دریا گنج	۱۹۳۲ء
آج کل (ماہانہ ٔ ادبی)	عابد کرہانی	پبلی کیشنز ڈویزن	۱۹۴۲ء
شاہراہ (ماہانہ ٔ ادبی)	پرکاش پنڈت	مکتبہ شاہرہ	۱۹۴۹ء
تحریک (ادبی)	گوپال متّل	انصاری مارکیٹ	۱۹۵۳ء
جامعہ (ماہانہ ٔ علمی)	ڈاکٹر عابد حسین ٔ سید جمال الدین ڈاکٹر ذاکر حسین صدیقی		۱۹۶۰ء
تخلیق (ادبی)	وشوناتھ درد	قرول باغ نئی دہلی	۱۹۶۰ء
تلاش (ادبی ٔ ماہ نامہ)	وشوناتھ درد	〃	۱۹۶۱ء
محور (ادبی دوماہی)	نریندر رنشچل	وسٹرن ایکس ٹینشن	
فن کار (سہ ماہی)	پرکاش پنڈت		
شعلہ و شبنم	.بمل جین		
نور جہاں	کبیر کوثر		
شان ہند (علمی)	سروَر تونسوی	۱۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج	
انیس ادب	اظہار اثر		
آریہ ورت	اظہار اثر		
جمالستان	شہزادہ تبسم		
برہان (مذہبی)	سید اکبر آبادی		
خاتون مشرق (برائے خواتین)	مستحسن فاروقی		
بانو (برائے خواتین)	زینت دہلوی		
آئینہ (ہفتہ وار)	ظ۔ انصاری		
ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند		
روشنی (ہفتہ وار)	ڈاکٹر عابد حسین		
سریتا	وشوناتھ		
تحریر (سہ ماہی علمی)	مالک رام		۱۹۶۷ء

عصری ادب (سہ ماہی ادبی)	محمد حسن	ادارۂ تصنیف دہلی	۱۹۷۲ء
آواز	مجاز لکھنوی	آل انڈیا ریڈیو دہلی	۱۹۷۳ء
اسلام اور عصر جدید (مذہبی)	ضیاء الحسن فاروقی	جامعہ نگر	۱۹۷۸ء
سروج (ماہنامہ ادبی)	ایچ اے حمید صدیقی		۱۹۶۰ء
گہوارہ (ماہنامہ)	امیر آغا قزلباش		۱۹۶۸ء
ماہ نو	ساحر ہوشیاری		
غالب نامہ (سہ ماہی ادبی)	یوسف حسین خاں	غالب انسٹی ٹیوٹ	۱۹۸۰
سوبرس (ادبی)	نشتر خانقاہی		
عصری آگہی (ماہنامہ ادبی)	قمر رئیس	وویک وہار	۱۹۷۸ء
کتاب نما (ماہنامہ 'ادبی)	شاہد علی خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۱۹۳۰ء
سطور (ادبی 'سہ ماہی)	کمار پاشی	کوچہ جلال غازی	۱۹۷۰ء
معیار (سہ ماہی ادبی)	نشان شاہد	صفدر جنگ انکلیو	
شعور (ادبی 'سہ ماہی)	بلراج مین را	شعور پبلشنگ راجندر نگر	۱۹۶۰ء
تناظر (ادبی)	بلراج ورما	تناظر پبلیکیشنز	
تیز گام	شاہد پرویز، عتیق الرحمٰن		
اردو دنیا	شہباز حسین	ترقی اردو بورڈ	
روبی (ادبی)	رحمٰن نیر		
ذہن جدید (ادبی 'سہ ماہی)	زبیر رضوی		۱۹۹۰ء
ایوان اردو (ماہنامہ 'ادبی)	مخمور سعیدی	اردو اکادمی	۱۹۸۷ء
شمع (فلمی)	یونس دہلوی		
فلمی ستارے (فلمی)	انیس دہلوی		
چتون			
ماحول	ظفر ادیب	اردو بازار	
گل فشاں (ماہنامہ نیم ادبی)	مخمور سعیدی		۱۹۷۹ء

اردو ادب (سہ ماہی ' ادبی)	خلیق انجم	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۷۸ء
اردوئے معلیٰ (ادبی)	خواجہ احمد فاروقی	شعبۂ دہلی یونیورسٹی	۱۹۵۶ء
سرخ و سیاہ			
مستانہ جوگی (ماہنامہ)	سونی لکھن سردار		
سچ رنگ	حیات اللہ انصاری		
آستانہ (مذہبی)	بیگم ریحانہ فاروقی	سوئی والان	
پیام مشرق	"	مرادی روڈ۔ بٹلہ ہاؤس	
امنگ (بچوں کا)	مخمور سعیدی	اردو اکیڈمی	۱۹۸۷ء
کھلونہ (بچوں کا)	"	"	
اکیسویں صدی	مشکور علی صدیقی	فراش خانہ	
ہمارا دور (نیم ادبی)	رضوان واحد	ٹمیا محل	
روشن ادب (نیم ادبی)	ایم۔اے خان	گلی قاسم جان	
تصویر وطن	اسرار جامعی	ذاکر نگر	
ہماڈائجسٹ (نیم ادبی)	عبدالوحید صدیقی	جنگ پورہ	
ہدیٰ (مذہبی)	خالد مصطفیٰ صدیقی		
جرائم (جرائم سے متعلق)	سلطان افسر	کوچہ بیرم خاں	
صوبیہ (ماہنامہ) نیم ادبی	آفتاب سعید	صوبیہ منزل	
گلفام (فلمی)	سلطان اختر	کوچہ بیرم خاں	
شبستاں ڈائجسٹ	یوسف دہلی	آصف علی روڈ	۱۹۶۶ء
فلمی تصویریں			
حسن پرست (فلمی)			
صبا رنگ			
سب رنگ ڈائجسٹ (نیم ادبی)			
پیام تعلیم (بچوں)	شاہد علی خاں	مکتبہ جامعہ	۱۹۶۴
انگار (ادبی)	مخمور سعیدی		

نرالی دنیا			
لمحات	عبداللہ کمال		
چنگاری (ادبی)	جمیلہ امجد	۳۰۹ بی دلشاد گارڈن	
پاکیزہ			
سات دن			
محراب			
نفرت			
چودھویں صدی			
راشٹریہ سہارا (سیاسی)	ماجد رمن		
افکار ملی (سیاسی)	سید قاسم رسول الیاس	ذاکر نگر	
پاکیزہ آنچل (سماجی)	خالد مصطفیٰ صدیقی	جنگ پورہ	۱۹۸۶ء
ہماری زبان (ادبی)	مسعود حسین خاں	انجمن ترقی اردو ہند	
آج کی خاتون (نیم ادبی)			
پیش رو (ادبی)	انور پاشا	جواہر لال نہرو یونیورسٹی	
اردو میڈیا (سیاسی)	سید مشیر احمد	مالویہ نگر	۱۹۸۸ء
عالمی ادب (ادب)	نند کشور وکرم	کرشن نگر	۱۹۹۱ء
یوجنا (علمی)	محبوب الرحمٰن فاروقی	پبلیکیشنز ڈویزن	۱۹۸۰ء
زندگی (ماہنامہ) (مذہبی)			
حسن اخلاق (سماجی)			
الرسالہ (مذہبی)	وحید الدین خاں	بستی نظام الدین	
نقش کوکن			
گلابی کرن	(نیم ادبی)		
فکر و آگہی (ادبی)			
ہمایوں	تاجور سامری		
نیا سفر (ادبی)	قمر رئیس		۱۹۹۳ء
الشفاء (طبی ڈائجسٹ)	سید اعجاز حسین	کوچہ چیلان دہلی	۱۹۹۳ء